اُردو نثر کی داستان

قسط ۷

ہر ماہ کی یکم تاریخ کو

غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اور
بعد کے حالات اور اُس کے
اُردو نثر پر اثرات !

مؤلف:

اے حمید

روشن کتابیں ۷

مطبوعات شیخ غلام علی، اَدبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

اُردو ادب کے شائقین کے لیے روشن کتابوں کی
ایک خصوصی پیش کش

اُردو نثر کی داستان

قسط ۷

سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے
اور بعد کے حالات اور اس کے
اُردو نثر پر اثرات

مؤلف
اے حمید

۷
روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

دُنیا کی ہر قومی اور علاقائی
زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب

* * *

نگران : شیخ نیاز احمد
مُدیر مسئول : ارشد نیاز
مُدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :
اے حمید - ایم - ایس ناز
محمد حنیف شاہد - عینکاف خالد

* * *

آرٹ : سلیم اختر

* * *

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

* * *

ادارہ :
مطبوعات شیخ غلام علی
اَدبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

فون نمبر :
۵۲۹۰۸۰ - ۶۱۸۵۹ - ۶۱۳۰۲۰

* * *

تار :
کتاب مَین (KITABMAN) لاہور

۱۸۵۷ء کا غدر اور اُردو نثر

ہمارے سلسلہ وار ادبی پروگرام کے بارے میں قارئین کے بے لاگ تبصرے مسلسل ہم تک پہنچ رہے ہیں۔ تجاویز و آرا، مشوروں اور تنقید نے ہمیں نئے ڈھنگ سکھائے ہیں اور نئے زاویوں کی طرف راہنمائی کی ہے۔ ہم اپنے ارفع خیال قارئین کے بے حد ممنون ہیں جن کا فراخدلانہ اور بے لوث تعاون ہر قدم پر ہمارے ساتھ ہے۔ 'اُردو نثر کی داستان' کی قسط نمبر ۶ میں ہم نے فورٹ ولیم کالج کے مشہور نثر نگاروں کے حالات بیان کیے تھے اور ان کی نثر کے نمونے بھی پیش کیے تھے۔

اس مرتبہ ہم ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دَور میں داخل ہو رہے ہیں۔ جنگِ آزادی جسے غدر کا نام بھی دیا جاتا ہے، اُردو نثر کے ارتقاء کے لیے ایک مہمیز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ ہمیں اُس دَور کی اُردو نثر میں غدر کے بارے میں بہت کم لٹریچر ملتا ہے تاہم بعد میں اُردو اَدب پر غدر کے نہایت گہرے اور دُور رس اثرات مرتب ہوئے۔

زیرِ نظر قسط میں جناب اے حمید نے جنگِ آزادی کی پُوری کہانی بیان کی ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ قارئین اس پوری منظر کشی کو اپنے سامنے رکھ کر اُس شہرِ خراباں کی حالت کا اندازہ کر سکیں جہاں اُردو نثر پروان چڑھ رہی تھی۔ دِلّی کے خون آلود ہنگاموں میں اُردو کے پرستار، آشفتہ حال و پریشان مارے مارے پھر رہے تھے۔ شہر کی ہر گلی خون کے آنسُو رو رہی تھی۔ یہ سماں قیامت سے کچھ کم نہیں تھا۔ خدا خُدا کر کے یہ ہنگامۂ دار و رسن ختم ہُوا۔ پھر کیا تھا۔ اُردو نثر جیسے اُبل کے باہر نکلی اور اپنے ساتھ اس ڈرامے کے ہزاروں کردار لے کر شہر شہر، کُوچے کُوچے میں پھیل گئی۔ اُردو نثر، جو اس سے پہلے عشق و مستی اور کیف و جذب میں ڈوبی ہُوئی تھی۔ اس نئے انقلاب سے روشناس ہونے کے بعد خون آلود داستانیں دُہرانے لگی۔ سر سید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد اس دَور کے معرکۃ الآرا نثر نگار ہیں جنھوں نے جنگِ آزادی کے اسباب اور اثرات و نتائج کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کو اندھیروں میں راہ دکھائی۔ ایک شمع اس دَور کے مولوی محمد باقر بھی تھے جن کا قلم تڑپ کر حرکت میں آیا اور انھوں نے اصل واقعات اور صورتِ حال کی نشاندہی کر کے مسلمانوں کے لیے راہِ عمل متعین کی ـــ موجودہ قسط کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ یقیناً اُردو نثر کے انقلابی دَور کے بارے میں حتمی رائے قائم کر سکیں گے۔

قارئین ! اس سلسلے کے ساتھ آج ہم عالمِ اسلام کی ایک نامور شخصیت 'شاہ فیصل شہید' کے حالاتِ زندگی اور کارناموں پر مشتمل ایک انقلاب آفریں کتاب بھی پیش کر رہے ہیں جسے ہمارے نوجوان ادیب عبدالکریم خالد نے عربی سے ترجمہ کیا ہے۔

نیاز احمد

اردو نثر پر غدر کے اثرات

تحریکِ آزادی ہند جسے غدر بھی کہا جاتا ہے۔ ایک زبردست اہمیت کی تحریک تھی جس کے اثرات نہ صرف ادب پر بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں طور پر مرتسم ہوئے۔ اگرچہ اس دور کے ایسے نثرنگار اور شاعر ہمیں بمشکل دو ایک نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے اس تحریک آزادی کے بارے میں کھل کر بات کی۔ پھر بھی بعض حق گو علما کی تحریریں اور ان کی زندگیاں ہمیں غدر کے بارے میں بڑی صاف اور واضح تصاویر مہیا کرتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نفسا نفسی کا زمانہ تھا۔ شریف آدمی اپنی عزت لے کر کونے کھدروں میں بیٹھ گئے تھے یا شہر کو چھوڑ کر باہر نکل گئے تھے۔ غالب ایسا بے باک شاعر بھی ہمیں اس پرآشوب دور کے بارے میں سوائے تین چار شعروں اور اپنے خطوں کی چند سطروں کے اور کچھ عطا نہیں کرتا۔ اپنی کتاب "دستنبو" میں اگرچہ اس نے غدر کے کچھ واقعات اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے مگر اس کا انداز تحریر اور نقطۂ نظر صلح کل اور عافیت پسندوں کا سا ہے۔ اس طرح سید ظہیر دہلوی نے اپنی کتاب "داستان غدر" میں بادشاہ اور انگریزوں کے نقطۂ نظر سے حالات کو پرکھا اور بیان کیا ہے۔

اردو ادب میں اگرچہ غدر کے بارے میں خالصتاً اس عہد کا لٹریچر ہمیں نہ ہونے کے برابر ملتا ہے لیکن غدر کے اثرات اردو ادب پر بڑے گہرے مرتب ہوئے۔ اس ایک تحریک نے ناکام ہو کر بعض ایسی تاریخی تحریکوں کو جنم دیا جو بعد میں چل کر اپنی منزل مقصود پر پہنچیں۔ سرسید اور حالی۔ اردو ادب کے یہ وہ ایسے روشن مینار ہیں جنہوں نے غدر کے اثرات اور نتائج کو سامنے رکھ کر مسلمان قوم کو اندھیروں میں راہ دکھائی۔ مولانا محمد حسین آزاد کا گھر لٹ گیا لیکن انہوں نے استاد ذوق کا دیوان بچا لیا اور صرف اسی ایک قیمتی اثاثے کو لے کر دلی سے پیدل لاہور پہنچے ـــ اس المناک واقعے کو مقبول جہانگیر اپنے مضمون "ہمیں بھول گئے" مطبوعہ حکایت ۱۹۷۲ء میں یوں بیان فرماتے ہیں۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے پہاڑی پر توپیں چڑھائیں۔ شہر کو تہس نہس کیا۔ مسلمانوں کے خون سے در و دیوار رنگین کیے۔ رذیلوں کو شریف اور شریفوں کو رذیل کیا۔ شاہ جہاں صاحب قرانی کی جامع مسجد کو پہلے زمین کے برابر کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر اس خانۂ خدا میں اپنے گھوڑے باندھے۔ علمائے دین میں سے کسی کو سولی پر لٹکایا۔ کسی کو مشکیں باندھ کر مارا۔ کسی کو بندوق کی سنگین سے ہلاک کیا اور کسی کو کالے پانی کی سزا دی۔ نواب مصطفٰے خان شیفتہ کو سات سال قید بامشقت کی سزا دی۔ مولوی محمد حسین آزاد کے والد گرامی مولوی محمد باقر نے دلی میں سب سے پہلے اردو کا اخبار نکالا تھا۔ انہوں نے اپنے اخبار میں تحریک آزادی کی زبردست حمایت کی۔ انہیں دوسرے محبانِ وطن کے ساتھ بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر جمنا کے کنارے لے جایا گیا۔ محمد حسین آزاد کی عمر اس زمانے میں سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ روتے پیٹتے چھپتے چھپاتے، مظلوموں کے اس گروہ کے پیچھے پیچھے چلے۔ شاہی گورے، بندوقیں کندھوں پر رکھے۔ عورتوں اور بچوں کا ایک غول چیختا چلاتا خاک اڑاتا فریاد کرتا۔ رحم کی دہائی دیتا ان کے پیچھے تھا۔ صبح کاذب نے یہ منظر دیکھا اور خوف سے منہ چھپا لیا۔ صبح صادق کی شفق خون میں نہا کر دلی کے آسمان پر نمودار ہوئی۔ مسلمانوں نے موت کو گلے لگانے سے پہلے خالقِ کون و مکاں کے سامنے سربسجود ہونے کی اجازت چاہی، اجازت مل گئی اور شاہی بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے۔ عین اس عالم میں مولوی محمد باقر نے اپنے بیٹے کو دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ پھر نماز کی نیت باندھ لی۔ اسی لمحے گوروں کی بندوقوں نے شعلے اگلے اور مسلمان قیدیوں کی لاشیں جمنا کی ٹھنڈی ریت پر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگیں۔ ایک شخص بھی ظالموں نے زندہ نہ چھوڑا۔ محمد حسین آزاد افتاں وخیزاں گھر پہنچے۔ استاد ذوق کی غزلوں کا پلندہ سر پر دھرا، اللہ داتا کا ہاتھ تھاما اور دلی کی گلیوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے نکل گئے اور کیسی عجیب بات ہے کہ وہ بھی ستمبر ہی کا مہینہ تھا جب جنگ آزادی اپنے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی۔ انگریز نے اُسے اپنے خلاف بغاوت جانا اور بالکل ٹھیک جانا۔ علمائے دہلی میں سے جن عاشقانِ الٰہی نے جہاد کے فتوے جاری کیے ان میں مولوی محمد باقر کا اسم گرامی سرِ فہرست تھا۔ انہوں نے اپنے اردو اخبار پریس میں نہایت دلیری سے ہزاروں کی تعداد میں ان فتاویٰ کے اشتہار چھاپ چھاپ کر ملک کے کونے کونے میں پھیلائے۔

> کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ انگریز دہلی پر چڑھ آتے ہیں اور اہلِ اسلام کے جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ عین فرض ہے یا نہیں؟ اور جو لوگ دوسرے شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں اُن پر بھی جہاد فرض ہے یا نہیں ـــ؟

اس استفتاء کے جواب میں سب سے پہلے جس شخص کا قلم حرکت میں آیا وہ مولوی محمد باقر تھے۔ انہوں نے ببانگ دہل کہا کہ جہاد موجودہ صورت میں فرض عین ہے اور شہر کے سب لوگوں کو حسب استطاعت اس میں حصہ لینا چاہیے۔ چنانچہ جتنے دن بھی دلی والوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ ان تمام مقابلوں میں مولوی محمد باقر ایک کمانڈر کی حیثیت میں آگے آگے رہے اور انہوں نے قلم کے ساتھ ساتھ تلوار سے بھی کفار کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔

"غدر کی شام" کے مصنف نے اس روز بلاخیز کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ۱۴ ستمبر کی تاریخ میں وہ لکھتا ہے کہ آج انگریزوں نے کشمیری دروازے پر حملہ کیا۔ (یہ وہی محلہ تھا جہاں مولوی محمد باقر کا مکان اور پریس واقع تھا) پھر وہ اس راستے سے شہر میں داخل ہوئے اور بالآخر دہلی پر قابض ہو گئے۔ انگریزی فوج حملہ کرتے ہوئے کوتوالی اور جامع مسجد تک پہنچ گئی۔ کوتوالی کے قریب ایک توپ نصب تھی جسے چند سوار اور بدمعاش چلا رہے تھے۔ ان کے گولوں سے انگریزی پلٹن والوں کے قریباً پانچ آدمی مارے گئے اور مجروح ہوئے۔ باغیوں نے جامع مسجد میں رہ کر مداخلت کی اور انگریزوں کی پیش قدمی کو روک دیا۔ انگریز کشمیری دروازے کی طرف پسپا ہو گئے۔ شہر میں پانچ دن جنگ و جدل رہا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بیٹے مولوی بشیر الدین احمد نے بھی اپنی ضخیم کتاب "واقعات دارالحکومت دہلی" میں ستمبر کی ۱۴ تاریخ کے حالات درج کیے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ صبح ہونے سے پہلے گوروں کی پلٹن، گورکھا پلٹن اور چند سواروں کے رسالے جس طرف سے فصیل ٹوٹ گئی تھی، سیڑھیاں لگا کر فصیل پر چڑھ گئے۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے مارے گئے۔ لیکن انگریزوں کے اوج کا ستارہ عروج پر تھا۔ باغی بھری ہوئی توپیں اور میگزین وغیرہ جہاں تھا وہیں چھوڑ کر بھاگ آئے۔

پھر جب کشمیری دروازے، اجمیری دروازے اور میگزین وغیرہ سب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو انہوں نے پن چکی اور نواب حامد علی خان کی کوٹھی کے پاس توپیں لگا دیں جس سے باغیوں کے نکلنے کے سب راستے بند ہو گئے۔ مولوی محمد باقر کا مکان دو طرفوں سے توپوں کی زد میں آ گیا۔ گوروں نے قتل عام شروع کیا اور مولوی محمد باقر ۱۵ ستمبر کے روز گرفتار کر لیے گئے۔ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ استادِ شاہ اپنے مکان کے ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھے "دستنبو" لکھ رہے تھے۔ غالب ستمبر ۱۸۵۷ء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ـــ

فتح مند فوج اس سڑک سے جو اس کے سامنے تھی، شہر میں داخل ہوئی۔ جو شخص راہ میں ملا، اُسے قتل کر دیا۔ معززین شہر اپنی آبرو بچائے گھر میں پڑے رہے۔ باقی شہر

سے بھاگ نکلے۔ کچھ ایسے تھے جنھوں نے مقابلہ کیا اور سینہ سپر ہو کر لڑے، دو تین روز تک شہر کے اندر کالوں اور گوروں میں جا بجا لڑائی ہوتی رہی، یہاں تک کہ کالے رفتہ رفتہ پیچھے ہٹتے گئے اور گورے شہر پر قابض ہو گئے۔ بالآخر ۱۸ ستمبر کو جمعے کے روز شہر کالوں سے خالی ہو گیا۔ اس کے بعد پکڑ دھکڑ قتل و غارت گری کا بازار اور زیادہ گرم ہوا"

مولانا محمد حسین آزاد "آبِ حیات" میں لکھتے ہیں۔

"فتح یاب لشکر کے بہادر دفعتہً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھا کر کہا یہاں سے نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اٹھا کر لے چلوں۔ استاد ذوق کی غزلوں کے جُنگ پر نظر پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسین! اگر خدا نے کرم کیا اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا، مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو یہ غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے۔ یہ ہیں تو وہ مر کر بھی زندہ ہیں، یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جُنگ اٹھایا بغل میں مارا، سجے سجائے گھر کو چھوڑا، ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا، ساتھ ہی زبان سے نکلا کہ حضرت آدم علیہ السلام بہشت سے نکلے تھے، دلی بھی ایک بہشت ہے، انہی کا پوتا ہوں، دہلی سے کیوں نہ نکلوں؟"

دادا کا بیان آپ نے دیکھا۔ اب پوتا آغا محمد باقر کی روایت بھی لگے ہاتھوں سن لیجیے "تاکہ مولوی محمد باقر شہید سے آپ کی آخری ملاقات ہو جائے۔ اور ہم ان کی روحِ پُر فتوح پر فاتحہ پڑھ کر آگے بڑھ چلیں۔" ان ۲۲ نیم جان افراد کو بیل گاڑیوں میں بٹھا کر ربّ العزت کی درگاہ میں عاجزانہ دعائیں کیں اور منشی امداد حسین کے ساتھ انہیں سونی پت روانہ کر دیا۔ خاندانی روایت یہ ہے کہ انہیں رخصت کر کے مولانا آزاد پھر سردار سکندر سنگھ کے پاس کشمیری دروازے چلے آئے۔ سردار سکندر سنگھ اور مولوی محمد باقر میں بڑی دوستی تھی۔ مولانا آزاد نے سردار سکندر سنگھ سے بصد منت سماجت التجا کی کہ میں اپنے شفیق باپ کی آخری بار زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ سردار بہادر نے جواب دیا۔ حالات خطرناک ہیں۔ آپ کا دہلی میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لیکن آزاد نہ مانے، آخر سردار صاحب راضی ہو گئے۔ قرار یہ پایا کہ آزاد ان کے ساتھ سائیس کا لباس پہن کر چلیں۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو گئے اور آزاد سائیس کے لباس میں ان کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ دہلی دروازے کے باہر میدان میں ایک ہجوم نظر آیا، جو دن کی دھوپ سے نڈھال تھا۔ فوجی پہرے میں وہ اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے تھے، اسی ہجوم میں ایک طرف ایک مردِ خدا نہایت خضوع و خشوع سے اپنے پروردگار کی عبادت میں محو تھا۔ وہ آزاد کے شفیق باپ مولوی محمد باقر تھے آزاد گھوڑے کی باگ تھامے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے اور منتظر تھے کہ کب آنکھیں چار ہوں۔ مولوی صاحب نے نماز ختم کر کے نظر اٹھائی تو سامنے اپنے پیارے بیٹے کو پایا، چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہوئے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ادھر یہی حالت بیٹے پر گزری۔ انہوں نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے، اور ساتھ ہی اشارہ کیا کہ بس آخری ملاقات ہو چکی اب رخصت! سردار صاحب نے اپنا گھوڑا موڑ لیا اور واپس چلے آئے۔ آزاد اس وقت تک سردار صاحب کے پاس مقیم رہے جب تک شاہجہان آباد کی بے گناہ روحیں قفسِ عنصری سے آزاد نہ ہو گئیں۔ جب اعلان ہو گیا کہ انہیں بارود مار کر شہید کر دیا گیا تو آزاد دہلی سے پورب کی جانب پا پیادہ روانہ ہونے لگے۔ وہ جب کبھی دہلی جاتے تھے تو اسی مقام پر کھڑے ہو کر سورۂ فاتحہ پڑھتے اور اپنے باپ کو یاد کر کے روتے تھے۔"

انھی جمی ہونے میں کئی برس لگ گئے۔ انگریزوں نے اپنی خون آشام کارروائیوں سے وحشت اور بربریت کی ایک فضا قائم کر دی تھی جس میں شرفا کا سانس لینا دشوار تھا۔ اٹھی ہوئی گردنیں ختم کرنے میں انہیں مزا آنے لگا۔ غدر کے ہنگامۂ رستاخیز میں جدھر جس کا منہ اٹھا ادھر نکل گیا۔ اسی ذلت و خواری اور غریب الوطنی میں نہ جانے کتنے مر کھپ گئے۔ جو باقی بچے وہ زندوں میں تھے نہ مردوں میں۔ کتنے تھے جنہیں آسودگی و فراخی دوبارہ نصیب ہوئی؟ ہاں بہادر شاہ ظفر کے سمدھی مرزا الٰہی بخش نے اپنی کارستانیوں اور کارگزاریوں کا خوب انعام پایا۔ انگریزوں نے اگرچہ مرزا الٰہی بخش کو چار گھوڑوں کی بگھی میں نکلنے کی اجازت دے رکھی تھی مگر دوسری طرف وہ مسلمانوں کے دل و دماغ سے ہمیشہ کے لیے نکل گئے تھے دلی کے جو اہلِ کمال دوسرے شہروں میں آشفتہ حال پھر رہے تھے۔ وہ سال چھ مہینے میں ایک آدھ چکر دلی کا ضرور لگاتے۔ شہر میں آتے، در و دیوار دیکھ دیکھ کر روتے، تڑپتے، لیکن دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ صورتِ حال مدت تک جاری رہی۔

غدر کے حالات انگریزوں کی زبانی

جنگِ آزادی کی تحریک کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے یہاں کے لوگوں کو اپنے خونی انتقام کا نشانہ بنایا اور شہر شہر گلی کوچوں کو محبانِ وطن کے خون سے رنگ دیا۔ ایک انگریز مورخ ایڈورڈ ٹامسن نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے واقعات اپنی ایک کتاب میں مرتب کیے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ حسام الدین نے "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ" کے نام سے کیا اس کے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

اس زمانے میں امرتسر کا ڈپٹی کمشنر مسٹر کوپر تھا۔ ٹامسن اس درندہ صفت انسان کی وحشت و بربریت کا حال یوں لکھتا ہے۔ کوپر کے ایک خط کا اقتباس ـــ

"جو لوگ ہمارے جیل خانوں میں قید ہیں ان کی نجات کا راستہ نہایت آسان ہے۔ اپنی باغیوں کو دیکھتے ہی فی الفور نکلسن کا نعرہ بلند کیا جائے انہیں پھانسی پر لے چلو۔"

ایک پادری کی بیوی لکھتی ہے۔

"جب بہت سے باغی گرفتار کر کے لائے گئے تو ان کو حکم دیا گیا کہ گرجا کے فرش کو صاف کریں۔ اگرچہ یہ لوگ اپنے عقائد کی بنا پر اس قسم کا کام خلافِ مذہب سمجھتے تھے لیکن سنگین کی نوک سے انہیں اس کام کے لیے مجبور کیا گیا۔ ان میں سے بعض نے نہایت پھرتی سے اس کام کو سر انجام دیا۔ محض اس خیال سے کہ شاید پھانسی سے بچ جائیں لیکن بے سود کیونکہ وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔"

گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور ساہیوال سے بے شمار مسلمانوں کو پابہ جولاں کر کے لایا گیا اور شاہی مسجد میں ان کے لیے پھانسیاں دی گئیں۔ اس المناک واقعہ کے بارے میں مسٹر جینیڈی لکھتا ہے۔

"وہ رات ہم نے پہرہ دینے میں بسر کی اور ہمارا زیادہ تر وقت ان قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے یا پھانسی پر لٹکانے میں گزرا جنہیں ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا۔"

ایک اور انگریز لکھتا ہے۔

"ہندوستانیوں کو اس کثرت سے پھانسیاں دی گئیں کہ بیان سے باہر ہے۔ الٰہ آباد سے کانپور آتے ہوئے دو دن کے اندر ۴۲ آدمیوں کو پھانسی دی گئی اور بارہ آدمیوں کو صرف اس جرم میں پھانسی دی گئی کہ جب فوج مارچ کرتی ہوئی ان کے سامنے سے گزری تو ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے؟ جہاں جہاں فوج پڑاؤ کرتی تھی، وہاں قرب و جوار کے تمام دیہات کو نذرِ آتش کر دیتی تھی۔ یہ کہنا کہ یہ کانپور کے مظالم کے حادثے کا جواب تھا۔ صحیح نہیں، کیونکہ کانپور کا شیطانی واقعہ ان حوادث کے بعد پیش آیا۔"

مسٹر ٹامسن ایک جگہ لکھتا ہے۔

"آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں حکومتِ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے عورتوں، بچوں،

مردوں اور بوڑھوں تک کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا ــــ"

ایک اور انگریز مصنف یوں لکھتا ہے۔

"دہلی میں خون ریزی کے عادی سپاہیوں نے جوشِ انتقام کو فرو کرنے کے لیے پھانسی دینے والے جلادوں کو رشوت دے کر آمادہ کیا تھا کہ وہ پھانسی کے تختے پر لوگوں کو زیادہ دیر تک لٹکتے رہنے دیں۔ تاکہ ان کے تڑپنے کی دردناک کیفیت دیکھ کر جسے ناچ کہتے تھے، اپنی خونخوار طبائع کے لیے دل چسپی کا سامان بہم پہنچا سکیں۔ ججھّر کے نواب صاحب کو جان دینے میں بہت عرصہ لگا ــــ"

حریت پسندوں کو پھانسی دینے کے طریقے کے بارے میں ٹامسن لکھتا ہے۔

"پھانسیاں دینے کے لیے رضا کاروں کی ٹولیاں بنا دی گئیں، جنھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے دیہات کا دورہ کیا۔ اس حالت میں کہ ان کے پاس پھانسی دینے کا سامان بھی مکمل نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریقے سے واقفیت تھی چنانچہ ان رضا کاروں میں سے ایک "شریف آدمی" اپنی کامیابی کا اس طرح فخریہ اظہار کرتا ہے کہ ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کیا کرتے تھے یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے تھے اور اوپر سے رسہ ڈال کر ہاتھی کو ہنکایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ملزم اس طرح سے تڑپنے لگتا اور جان کنی کی حالت میں اکثر اوقات انگریزی کے آٹھ (8) کے ہندسے کی شکل بن جاتا تھا۔ لکھنو پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ چنانچہ ہر ہندوستانی کو قطع نظر اس کے کہ وہ سپاہی ہے یا دیہاتی، بے دریغ تہِ تیغ کر دیا گیا۔ اس سے نہ کوئی سوال کیا جاتا تھا نہ اس قسم کا تکلف روا رکھا جاتا تھا، بلکہ محض سیاہ رنگ ہی اس کے مجرم ہونے کے لیے کافی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ اور ہلاکت کے لیے ایک رسہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا ــــ"

دہلی پر انگریزی فوج کے قبضے کے بعد کا حال مسٹر ٹامسن یوں بیان کرتا ہے۔

"دہلی کے شہر کے بلند مقام پر ایک چوکور سولی نصب کی گئی تھی جہاں ہر روز پانچ اور چھ اشخاص کو ایک ساتھ پھانسی دی جاتی تھی۔ سولی کے قریب ہی انگریز افسران سگرٹوں کے کش پر کش اڑاتے ہوئے لاشوں کے تڑپنے کا نظارہ کیا کرتے ــــ"

لارڈ رابرٹس اپنی والدہ کو ایک خط میں لکھتا ہے۔ یہ خط ٹامسن نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے

"ہم پشاور سے جہلم تک پیدل سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستہ میں کچھ کام بھی کرتے آئے یعنی باغیوں سے اسلحہ چھینا اور پھانسی پر لٹکا دینا۔ چنانچہ توپ سے باندھ کر اڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے اکثر استعمال کیا ہے اس کا لوگوں پر ایک خاص اثر ہوا اور ہماری ہیبت لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ یہ طریقۂ سزا نہایت دل خراش ہے۔"

کشمیری دروازے پر قبضے کا حال ملاحظہ ہو۔

"ہر سڑک پر لوگوں کو بے دریغ قتل کر دیا گیا، جو سامنے نظر آتا تھا اسے گولی مار دی جاتی تھی یا تلوار سے اس کی گردن اڑا دی جاتی تھی۔ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہریوں کو ایک ہی دن میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ دہلی میں مسلمانوں کے قتل عام کی منادی کی گئی۔ ہمارے اکثر نوجوان تو محض خون گرمانے کی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی اردلیوں اور پوربی گھسیاؤں وغیرہ کو گولی سے اڑا دینے کی تمنا کا اعلانیہ طور پر اظہار کر چکے تھے۔"

جان نکلسن ایڈورڈز کو ایک خط میں لکھتا ہے۔

"ہمیں ایسا قانون پاس کرنا چاہیے جس کی رو سے ہم انہیں زندہ بھی جلا سکیں یا زندہ ان کی کھال اتار سکیں، یا گرم سلاخوں سے ان کو اذیت دے کر فنا کے گھاٹ اتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ بنا دیتا ہے میری یہ دلی خواہش ہے کہ کاش دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں سنگین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔"

ٹامسن آگے چل کر لکھتا ہے۔

"نکلسن کو اپنی آرزو کے پورا ہونے میں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مسٹر ٹامسن نے اپنے بعض قیدیوں کی دردناک سرگزشت سرکاٹن کو یوں بیان کی ــ شام کے وقت ایک سکھ اردلی میرے خیمے میں آیا اور سلام کر کے پوچھنے لگا۔ آپ غالباً یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ میں فوراً لپک کر قیدیوں کے خیمے میں گیا جہاں ان بدنصیب مسلمانوں کو عالمِ نزع میں بے حال دیکھا۔ یعنی ان کی مشکیں بندھی ہوئی تھیں اور وہ برہنہ زمین پر لیٹے ہوتے تھے اور سر سے لے کر پاؤں تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغ دیا گیا تھا۔ اس روح فرسا نظارے کو دیکھ کر میں نے اپنے پستول سے ان کا خاتمہ کر دینا ہی ان کے حق میں مناسب سمجھا۔"

آگے چل کر ٹامسن رقمطراز ہے۔

"ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ بدنصیب قیدی کے جلتے ہوئے گوشت سے مکروہ بدبو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی۔ انیسویں صدی میں جبکہ تہذیب و شائستگی پر ناز کیا جاتا تھا۔ ایک ایسا دردناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک انسان نہایت وحشیانہ طریقے سے زندہ آگ میں جلایا جا رہا ہے اور سکھ اور یورپین نہایت اطمینان اور خوشی سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر اس کے گرد کھڑے دیکھ رہے ہیں گویا وہ ایک تفریح کا سامان ہے ــ"

ٹامسن ایک اخبار کے حوالے سے لکھتا ہے۔

"ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈی لین نے لکھا تھا۔ زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا، پھانسی سے پہلے اُن کے جسم پر سور کی چربی ملنا، یا زندہ جلانا...... ایسی مکروہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب بھی کبھی اجازت نہیں دیتی۔ ہماری گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں۔"

ٹامسن ایک انگریز نامہ نگار کے حوالے سے ایک واقعہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

"لڑائی کے ختم ہو جانے پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور یہ معلوم ہونے پر کہ اس قسم کی موت کی وہ کوئی خاص پروا نہیں کرتے تو ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ چنانچہ ایک روز ایک توپ کے بہت بڑے دھماکے سے ہم چونک پڑے جس کے ساتھ ہی ایک ناقابلِ بیان دھیمی گر وحشیانہ چیخ بھی سنائی دی۔ دریافت کرنے پر ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ یہ نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھرا ہوا تھا۔ جس کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا جسم ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے اور اس کا سر ایک راہرو پر اس زور سے گرا کہ اس کے بھی چوٹ آئی۔"

ایک انگریز مورخ لکھتا ہے۔

"بے گناہ شہریوں کو جبکہ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے، گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ بلکہ عمر رسیدہ انسانوں کو بھی جن کے جسم رعشے سے کانپ رہے تھے، کاٹ کر رکھ دیا گیا۔"

سرسید اور غدر

داستان تاریخ اردو میں حامد حسن قادری لکھتے ہیں۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں بغاوت ہوئی اور ۱۲ مئی کو یہ خبر بجنور پہنچ گئی۔ وہاں اس وقت بیس یورپین عورتوں بچوں سمیت تھے۔ مسٹر شیکسپیر کلکٹر و مجسٹریٹ تھے۔ جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمایاں ہوئے تو یہ لوگ بہت گھبرائے۔ لیکن سرسید نے جا کر ان کو تسلی دی اور کہا کہ جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاشیں کوٹھی کے سامنے پڑی ہیں، اس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں۔ چنانچہ سرسید مع ہندوستانی افسروں کے تمام رات مسلح ہو کر کلکٹر کی کوٹھی پر پہرہ دیتے رہے۔ ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے یا شہر میں گشت کرتے گزر جاتی تھی۔ آخر کار باغیوں کو نشیب و فراز سمجھا کر انگریزوں کے قتل سے باز رکھا اور سب کو رڑکی روانہ کر دیا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بجنور میں باغیوں کی عملداری ہو گئی اور وہ لوگ سرسید کے ان رفقا، میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خان کے قتل کے درپے ہو گئے۔ سرسید نے ایک مہینے تک بجنور کا انتظام بخوبی قائم رکھا۔ لیکن باغی دشمن ہو گئے تھے۔ اس لیے سرسید اور ڈپٹی رحمت خان میرٹھ کے ارادے سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں مختلف مقامات پر چند بار باغیوں نے ان کے قتل و غارت کا ارادہ کیا لیکن ہر موقع پر بعض خیر خواہ زمینداروں نے بچا لیا۔ اثنائے راہ میں چاند پور سے چل کر سرسید نے ہلدور پہنچ کر علالت اور راستے کی کوفت کے سبب سے چند روز مولوی محمود عالم صاحب کے مکان پر، جو ان کے دوست تھے، مقام کیا اور اپنی مفصل سرگزشت حکام انگریزی کو لکھ بھیجی اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔

سرسید میرٹھ میں کئی مہینے رہے۔ وہاں معلوم ہوا کہ دہلی میں انگریزی فوج نے ان کے گھر کا اسباب لوٹ لیا۔ ان کے ماموں اور ماموں زاد بھائی مارے گئے۔ ان کی والدہ اور خالہ دہلی میں تھیں۔ سرسید میرٹھ سے دہلی آئے۔ گھر تباہ ہو چکا تھا۔ والدہ اور خالہ کو واپس میرٹھ لے گئے۔ انگریزوں نے رڑکی میں اپنی فوج جمع کر لی۔ سرسید بھی تمام عملہ بجنور کے ساتھ بحکم سرکار رڑکی بلائے گئے۔ تمام روہیل کھنڈ سخت باغی تھا۔ بجنور، مراد آباد، بریلی کے ضلع سرکشوں کے زیر اثر تھے۔ ان اضلاع پر قبضہ کرنے کے لیے رڑکی سے فوج روانہ ہوئی۔ سرسید بھی ساتھ تھے۔ اس موقع پر سرسید نے کمال دانشمندی اور دلیری سے کام کیا۔ حکام سرکاری میں یہ بحث پیش آئی کہ اب ان اضلاع سرکش میں کون لوگ باغی تصور کیے جائیں۔ سرسید نے اس باب میں سرکاری افسران فوج سے گفتگو کی اور بہت بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہئیں جو اب سرکار سے مقابلے کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو فسادات رعایا، ہندو، مسلمان دونوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں کیے اُن کے سبب سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس وقت اگر سرسید جرأت نہ کرتے اور یہ فیصلہ نہ کرا دیتے تو ضلع بجنور بالکل تباہ ہو جاتا۔ خصوصاً کوئی مسلمان اس ضلع میں باقی نہ رہتا۔ سرسید کی اس حکمت عملی کے سبب سے ضلع بجنور غدر کے نتائج میں سب سے کم مبتلا ہوا اور ضلع مراد آباد میں ضبط شدہ جاگیریں مسلمانوں کو سب سے زیادہ واپس دی گئیں۔

خدمات غدر کا صلہ

گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری جو سرسید سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ لیکن گورنمنٹ نے ان کی خدمات کی قدر کی اور ان کے صلے میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپے کا اور دو سو روپیہ ماہوار کی پولیٹیکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی۔ میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسان چاند پور ضلع بجنور کا تعلقہ اس جرم میں کہ ان کی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی سرکار نے ضبط کر لیا تھا اور جس طرح دیگر خیر خواہان سرکار کو باغیوں کی ضبط شدہ جائیدادیں دی گئی تھیں یہ تعلقہ چاند پور سرکار نے سرسید کو دینا چاہا، لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ سرسید نے خود ایک مرتبہ اس کے متعلق کہا تھا۔ بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہیں ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائیدادیں لے کر تعلقہ دار بنوں ـــــ

سرسید غدر کے بعد

اپریل ۱۸۵۸ء میں سرسید صدر الصدور ہو کر مراد آباد گئے جہاں چند کتابیں لکھیں، ۱۸۶۰ء میں وہاں سخت قحط پڑا۔ قحط کا انتظام سرسید نے اس خوبی سے کیا کہ انسانی ہمدردی کا اس سے بہتر نمونہ ملنا مشکل ہے۔ قحط زدوں کی سرکاری امداد کے علاوہ خود سرسید کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو تقسیم کی جاتی تھیں۔ مراد آباد کے ایک عالم اور رئیس مولوی عالم علی کو بغاوت کے الزام میں سزائے موت سے بچایا۔ مولوی صاحب نے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے مکان میں پناہ دی تھی۔ باغیوں نے زبردستی گھر میں گھس کر ان سب کو قتل کر دیا اور مولوی صاحب کے گھر کا کوئی آدمی نہ مارا گیا۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ ان کے اشارے سے یہ قتل عمل میں آیا۔ سرسید صاحب نے مولوی صاحب کی بے گناہی ثابت کر کے انہیں بری کرا دیا۔ چار برس کے بعد ۱۸۶۲ء میں سرسید کی بدلی مراد آباد سے غازی پور ہو گئی۔ وہاں بھی علمی اور تعلیمی کام کرتے رہے۔ غدر کے دوران کی سرسید کی زندگی کی مصروفیات یہاں ختم ہوتی ہیں۔ ان کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آئے گا۔ اب ہم ایک ایسے عینی شاہد کی کتاب سے غدر کا حال درج کرتے ہیں جو بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے منسلک تھا۔ اگرچہ اس کا نقطۂ نظر شاہ پرستوں کا ہے اور یوں حریت پسندوں کو وہ باغیوں کے نام سے یاد کرتا ہے۔ بہر حال وہ چونکہ تمام حالات کا چشم دید گواہ ہے اس لیے سند کے طور پر اس کی کتاب کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

غدر کا آنکھوں دیکھا حال

ظہیر دہلوی اپنی کتاب داستانِ غدر میں جنگ آزادی کی اس آگ کے بارے میں جس کا شعلہ پہلی بار دہلی کے افق پر نمودار ہوا یوں تحریر فرماتے ہیں۔

ہمارے ہاں کمرے کے گھنٹے میں سات بج کر پچیس منٹ پر سوئی آ کر قائم ہوتی ہے۔ راقم روزے کی نیت باندھ کر چھپر کھٹ پر دراز ہوا تو جوانی کی نیند ہے۔ بائیس کا سن۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ چار مہینے شادی کے کو گزرے ہیں۔ بلند مکانات سے جب آفتاب بلند ہو چکا ہے اور کمرے کی منڈیر سے دھوپ اتر کر نصف دروں تک آ پہنچی ہے اور چھپر کھٹ کے پردوں میں چھن چھن کر تمازت آفتاب بدن پر اثر کرنے لگی ہے۔ جب خواب سے بیدار ہوا ہے۔ مکان کی چھت فراخ ہے تو کمرے کے آگے کا صحن وسیع ہے۔ منہ دھو کر رومال سے صاف کیا۔ سامنے کرسی دار مونڈھے پر آئینہ دھرا ہے۔ کنگھی سے بالوں کو سلجھا کر مروڑی دے رہا ہوں کہ یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خادمہ گھبرائی ہوئی سانس چڑھا ہوا، ہوش حواس پراگندہ، پسینے پسینے، منہ فق، رنگ زرد، رہے اوسان زینے پر چڑھتی آتی ہے۔ آتے ہی دھم سے چوکوں پر گر گئی۔

ہیں ہیں مبارک! خیر باشد! آج ایسی گھبرائی ہوئی کہاں سے آئی۔ گھر میں تو خیر ہے۔ مبارک سلام کر کے ہاتھ کے اشارے سے ذرا سانس قائم ہوئے تو کہتی ہوں۔ قریب چار منٹ کے سر پکڑے بیٹھی رہی۔ جب ہوش درست ہوئے تو کہا۔

"میاں! مجھے نواب صاحب اللہ تمہاری خوش دامن نے بھیجا ہے اور تمہاری خیریت معلوم کی ہے کہ تم گھر میں ہو یا قلعے میں؟"

"میں تو اچھا بھلا ہوں، خدا کا فضل ہے۔ تم تو بسبب رمضان المبارک دوسرے

تیسرے روز جاتا ہوں۔ آج تو نہیں گیا۔ اور میری بیوی بھی تندرست ہیں۔ یہ دیکھ لے چھپر کھٹ میں سوئی ہیں:

مبارک :۔ اور یہ تختوں پر چدر اوڑھے کون سوتا ہے۔

راقم :۔ فہم النساء مامی سوتی ہیں۔

مبارک :۔ بی مامی! ابھی تک اٹھی نہیں، شہر کی تجھے کچھ خبر ہے شہر میں تو غدر ہو رہا ہے۔ تم پڑی سوتی ہو۔

مامی :۔ لے چل کمبخت دور پار۔ غدر کیوں ہونے لگا۔ تو ایسی ہی فال زبان سے نکالا کرتی ہے۔ صبح ہی صبح کہاں سے آئی ہے۔ میں رات بھر کی جاگی ہوئی ہوں۔ مجھے سونے دے۔

مبارک :۔ غدر کیسا میاں! دکانیں شہر کی بند ہیں بازار میں سوار پھر رہے ہیں۔ شہر میں خاک اڑ رہی ہے۔ جب تو نواب صاحب نے تمہاری خیریت منگائی ہے۔

راقم : مبارک کیا کہتی ہے؛ سوار کیسے؛ کس کے سوار؟

مبارک :۔ میاں! میں تو عورت ذات ہوں۔ مجھے کیا معلوم کس کے سوار ہیں۔ اگر میں مرد ہوتی تو ان سے پوچھتی کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟

راقم :۔ مبارک! تم نے سواروں کو آنکھ سے بھی دیکھا یا سنی سنائی کہتی ہو؟

مبارک :۔ ہاں میاں! آنکھ سے دیکھ کر آئی ہوں۔ جامع مسجد کے نیچے پانچ سات سوار پھر رہے تھے۔ بلکہ میرے پیچھے پیچھے شاہ بولا کی بڑ تک آئے میں، روشن پورہ میں چلی آئی وہ قاضی کے حوض کی طرف چلے گئے۔

راقم :۔ کس وضع کے سوار تھے، کیسے کپڑے تھے کیسے گھوڑے تھے؟

مبارک :۔ کپڑے تو ان کے سفید ہی تھے مگر گھوڑوں کا سامان انگریزی تھا۔

یہ واقعہ سن کر مجھ پر حیرت کا عالم ہوا اور چند منٹ تک سکوت میں گردن جھکائے ہوئے خاموش بیٹھا رہا اور خیالات فاسدہ میرے دماغ میں گردش کرتے رہے۔ یکایک خیالات نے پلٹا کھایا اور طبیعت میں یہ بات آئی۔ آہا وہ جو بزرگوار اولیاء اللہ نے مجھ سے چند کلمات بطور پیشگوئی کہے تھے ان کا ظہور ہوا ——

اس واقعے سے چار پانچ ماہ پیشتر ایک روز میں بازار پایہ والوں میں ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھا ہوا کتابوں کی سیر کر رہا تھا کہ یکایک ایک لحیم و شحیم بزرگوار، دراز قامت فربہ اندام دراز ریش، سیہ فام کھچڑی داڑھی، ساٹھ برس کا سن و سال، ڈھیلا انگرکھا، شرعی پاجامہ گول ٹوپی، ہاتھ میں عصا گلے میں تسبیح ڈالے وارد ہوئے اور دکان پر آکر بولے۔ بھائی سلام علیک! مولوی یحییٰ کتب فروش نے اور میں نے تعظیم کی۔ مولوی یحییٰ نے کہا۔

"تشریف لائیے حافظ صاحب"

حافظ صاحب راقم کے پاس آکر بیٹھ گئے اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"بھائی! ان کتابوں میں کوئی کلام مجید بھی ہے؟"

میں نے کہا "حضرت ہاں! ہے"۔

میں نے ایک لکھنؤ کے چھاپے کا کلام اللہ اتار کر حافظ صاحب کے حوالے کیا۔ حافظ صاحب تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ ایک رکوع جب ختم ہو گیا تو حافظ صاحب پر حالت جذب طاری ہوئی اور آنکھیں سرخ ہو گئیں اور چہرہ تمتما گیا۔ گردن کی رگیں پھول گئیں اور حالت غیظ و غضب میں بازار کی جانب ہاتھ اٹھا کر فرمانے لگے۔

"اجی! دیکھو وہ مار ڈالا، وہ مار ڈالا۔ وہ پھانسی دے دی، وہ پھانسی دے دیا۔ واہ واہ! کیا خوب تماشہ ہے، ایک کو ایک مارے ڈالتا ہے۔ ایک کو ایک پھانسی دے رہا ہے اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اور بار جن صاحب بیٹھے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔"

یہ الفاظ فرما کر حافظ صاحب خود ہی فرمانے لگے۔

"بس خاموش رہو، تم کو کس نے اذن دیا ہے کہ اسرار الٰہی کا پردہ فاش کرو۔ یہ کہہ کر"

یہ کہہ کر حافظ صاحب نے گردن جھکائی اور پھر تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ ایک رکوع پڑھ کر پھر وہی حالت طاری ہو گئی اور دوبارہ پھر انہیں الفاظ میں وہی کلمات سابق ادا کیے غرض کہ تین بار یہ ظہور میں آیا۔ اس کے بعد حافظ صاحب نے کلام مجید کو بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا سر پر رکھا اور میرے حوالے کیا۔ میں نے الماری میں رکھ دیا۔ پھر حافظ صاحب راقم سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔

"تم شہر میں بیٹھے کیا کرتے ہو۔ باہر دو جواڑے کی سیر کیا کرو۔ دنیادار کو گھر میں بیٹھے رہنا نہ چاہیئے ــــ"

میں خاموش بیٹھا رہا مارے رعب کے کچھ نہ کہہ سکا۔ پھر فرمانے لگے "تمہارے والد خط نسخ کے بہت بڑے خوش نویس ہیں۔ تم اپنے والد سے مجھے ایک کلام اللہ ایسا لکھوا دو کہ ایک ورق میں سیپارہ تمام ہو جائے اور تیس ورق میں تیس سیپارے تمام ہو جائیں۔"

"بہت بہتر میں عرض کروں گا۔"

"بھائی میرے واسطے پرانٹھے اور میتھی کا ساگ پکوا کر لانا۔"

"بہت بہتر آپ کہاں ملیں گے؟"

"یہ برابر میں جو نانبائی کی دکان ہے۔"

یہ کہہ کر سلام علیک کہہ کر تشریف لے گئے۔ ہنوز یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ امیر خان خدمت گار نے دروازہ پر ایک خادمہ کو میرا نام لے کر آواز دی کہ میاں سوتے ہیں کہ جاگتے ہیں۔ اگر سوتے ہوں تو جگا دو۔ ڈیوڑھی سے چوبدار حکم لے کر آیا ہے۔ یہ آواز میرے گوش گزار ہوئی۔ میں جس طرح بیٹھا ہوا تھا نیچے اتر گیا اور باہر دیوان خانہ میں پہنچا۔ چوبدار نے حکم سنایا کہ حضور کا حکم ہے، از نواب محبوب علی خان کے، کہ جتنے ملازم سرکار، ہیں سب آکر ڈیوڑھی پر حاضر ہوں۔ آپ جلدی سوار ہو کر جائیے میں یہ سن کر آداب بجا لایا اور چوبدار سے کہا۔ ابھی کپڑے پہن کر کمر باندھ کر روانہ ہوتا ہوں۔ گوردھن سے کہا گھوڑے پر چار جامہ کسو۔ امیر خان سے کہا تیار ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر گھر میں آیا۔ والد ماجد باہر کے دالان میں تختوں کے فرش پر سوزنی بچھی ہوئی تھی تکیہ لگا ہوا، بعادت معہودہ بیٹھے ہوئے کلام مجید لکھ رہے تھے۔ ان کی خدمت میں جا کر آداب بجا لایا۔ دو زانو ہو کر بیٹھا۔ میری جانب مخاطب ہو کر پوچھنے لگے۔ خیر باد! میں نے تمام حال گزارش کیا۔ یہ کہہ کر جزو کلام پاک کو ہاتھ سے رکھ دیا اور چند منٹ تک گردن جھکا کر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر گردن اٹھا کر فرمانے لگے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ کہاروں سے کہو پالکی نکالیں میں جاتا ہوں۔

میں نے دست بستہ ہو کر کہا جناب آپ تشریف رکھیں۔ غلام نوکری میں جاتا ہے اور چوبدار نے آپ کا نام نہیں لیا۔ مجھے یہ حکم سنایا ہے۔ آپ کی نوکری تو حضور سے معاف ہے۔ آپ گھر سے خبردار رہیے۔ آدمیوں کو ڈیوڑھی پر چھوڑے جاتا ہوں۔ فقط امیر خان اور گوردھن چاکر کو ساتھ لیے جاتا ہوں۔ اور باقی پانچوں خدمت گار یہاں موجود ہیں۔ یہ عرض کر کے میں اوپر کوٹھے پر آیا اور کپڑے بدلے، پگڑی باندھی اور جب چلنے لگا تو میرے گھر کے آدمی میری طرف دیکھ کر آبدیدہ ہونے لگے۔ میں کلمات تسلی کہہ کر نیچے آیا۔ ارادہ ہوا کچھ ہتھیار ساتھ لے چلنا ضرور ہے۔ تلواریں، چھری وغیرہ جو سال ہا سال سے بے غور پڑے تھے ان کو دیکھنے لگا کہ اگر کوئی کام کی ہو تو لیتا چلوں۔ اس میں والد بزرگوار نے منع فرمایا کہ خبردار ایسی حرکت نہ کیجیو۔ انگریزی عملداری ہے۔ خدا جانے کیا معاملہ ہے۔ سیدھا ڈیوڑھی پر چلا جا۔ جب کچھ حکم ہو اور حضور اجازت دیں تو جب ہتھیار کو ہاتھ لگائیو۔ غرض کہ میں سوار ہو کر آیا۔

جس وقت چھوٹے دریبے کے پھاٹک سے باہر نکلا ہوں تو دیکھا کہ تین چار سوار کرتے پہنے اور دھوتیاں باندھے ہوئے سر سے ایک چھوٹا سا انگوچھا لپیٹے ہوئے فقط ایک کرنچ ڈاب میں اور وہ پیپل کے درخت کے سایہ میں نہر کی دیوار سے لگے کھڑے ہیں اور ہندو لوگ ان کی سربراہی کر رہے ہیں۔ کوئی پوریاں لے آیا ہے۔ کوئی مٹھائی کا دونا لیے آ رہا ہے کوئی لوٹا پیتل کا پانی سے بھر کر لا دیتا ہے۔ میں نے کچھ ان کی طرف توجہ نہ کی اور قلعہ کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں سے چند قدم آگے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گاجی معاش پہلوان نہر والا آگے آگے کرتہ پہنے ہوئے لنگر لنگوٹ بندھا، سر پہ ٹوپی، کاندھے پر لٹھا اور پیچھے اس کے پچاس سو شہدوں کا انبوہ۔ سب کے لنگر لنگوٹے کسے، ہاتھ میں بانڈیاں لیے چلے آتے ہیں۔ اشرف بیگ کے کمرے کے نیچے آکر اس نے ایک لٹھ سڑک کی لالٹین پر دے مارا اور لالٹین چھن ہو کر گر پڑی اور منہ سے کہا کہ یہ ایک کافر دے مارا اور پھر ایک بزاز کی دکان کا قفل توڑنے لگے۔ میں گھوڑا بڑھا کر آگے چلا گیا۔ پھر آگے اور دو چار سوار چلتے پھرتے دیکھے۔ نہ میں نے ان سے کچھ کہا۔ نہ انہوں نے میری مزاحمت کی۔ میں سیدھا کوتوالی سے ہوتا ہوا خونی دروازہ کے آگے پہنچا تو دیکھا کہ ایک انبوہ کثیر بدمعاشاں کا ہے اور صرافوں کی دکانیں لٹ رہی ہیں۔ امیر خان میرا خدمت گار ساتھ آتے آتے ٹھٹھک رہا۔ جب قلعہ کے دروازے پر پہنچا ہوں تو یہ تماشا دیکھا کہ قلعہ کی کھائی کے برابر کوئی پچاس سوار جمع ہیں اور انگریزی کتابوں کے ورق پھٹے ہوئے اڑتے پھرتے ہیں۔۔

ہوا بہت تیز چل رہی ہے۔ کاغذ اڑ اڑ کر قلعے کے دروازہ کی طرف آتے ہیں اور قلعہ کے دروازے کے فاصلہ سے چار گز وڑی کھائی کے کٹہرے سے لگا ہوا ایک مست ننگ دھڑنگ بیٹھا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا موٹا انگریزی جوتا ہے اور کاغذ اڑ اڑ کر اس کے پاس آتے ہیں وہ مجذوب غصہ میں ان کاغذوں پر جوتا مارتا جاتا ہے اور برا بھلا کہہ رہا ہے۔ خیر یہاں سے گھوڑے کو بڑھا کر میں نقار خانہ کی ڈیوڑھی پر اور گھوڑے سے اتر کر ڈیوڑھی سے گزر کر دیوان خانہ خاص کے صحن میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ دیوان خاص کے در میں ایک ستون کے درے لگے ہوئے محبوب علی خان بیٹھے ہیں اور سب درباری دورویہ صفیں باندھے بیٹھے ہیں۔ میں نے جا کر سلام علیک کی اور ایک صف میں بیٹھ گیا۔ ان دونوں صاحبوں کے بیچ میں ایک مسلمان پنجابی بزاز کہ دکان قلعہ کے سرے پر تھی اور سب شہزادے اور بیگمات کے یہاں وہی کپڑا دیا کرتا تھا، بیٹھا ہے اور اس کے آگے مین سکھ لٹھے کے تھان اور طاقے سیاہ بانات کے دھرے ہیں اور شکھا خیاط خاندانی والا بیٹھا ہے۔ حکیم احسن اللہ خان بتلاتے جاتے ہیں اور وہ کفن بیونتا جاتا ہے۔ میری عقل حیران ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کس کا کفن تیار ہو رہا ہے۔ ایسا کون شخص مارا گیا ہے جس کے تجہیز و تکفین کی اتنی تیاری ہو رہی ہے۔ میرے برابر میر فتح علی اور ایک جانب مرزا احمد بیگ داروغہ آبدار خانہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے چپکے چپکے دریافت کرنے لگا۔ وہ کچھ تھوڑا سا حال بیان کر پائے تھے کہ حکیم احسن اللہ خان کے کان میں کچھ بھنک پہنچی۔ انہوں نے بآواز بلند کہا کہ کیوں نہیں کہتے کہ صاحب ریذیڈنٹ مارے گئے ہیں اور بادشاہ کا حکم ہے کہ میرے سب ملازم جائیں اور صاحب کی تجہیز و تکفین کریں اور قلعہ دار صاحب کی مانجی میں ان کو دفن کریں اور حضور کو ان کے مارے جانے کا بڑا قلق ہے۔ سات آدمی مارے گئے ہیں۔ دروازہ قلعہ پر لاشیں پڑی ہیں۔

یہ کلمات سن کر میرے ہوش و حواس باختہ ہو گئے۔ پانچ چھ منٹ تک تو مجھے کاٹو تو خون نہ تھا۔ ہنوز کفن تیار ہونے پایا تھا کہ وہی سوار محسن کش لال پردے کے دروازے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ حکیم احسن اللہ نے ان کی شکل دیکھ کر کہا کہ سب صاحب فاتحہ خیر پڑھیں قضا آن پہنچی۔ اس اثنا میں وہ دیوان خانہ خاص کے نیچے آن پہنچے اور گھوڑوں سے اتر اتر کر گھوڑے تو جالی کٹہرے سے اٹکلتے اور آپ اندر آگئے۔ آتے ہی بیٹھ گئے۔ قریب ۱۳۰ آدمی ہوں گے اور اکثر ان میں افسر تھے۔ وضع ان کی وہی پوربیوں کی تھی۔ نہ افسر معلوم ہوتا تھا نہ سوار۔ سب کی وضع ایک سی تھی۔

میگزین اڑا دیا

"پانچ بج چکے ہیں۔ دن ڈھل گیا ہے۔ ہنوز قیامت برپا ہے یکایک اس زور کی مہیب آواز ہوئی کہ اگر ایک ہزار توپ کا برابر فیر ہوتا تو اتنی گرج نہ ہوتی۔ خانساماں کا مکان شاہجہانی عمارت ہے جس کا آثار چہار فٹ کے برابر ہے۔ اس درجہ گری کہ گرد باد ہو گئی۔ مغرب کی جانب جو نگاہ کی تو دیکھا کہ ایک غبار دھوئیں کا زمین سے لگا کر تا آسمان بلند ہوا۔ آسمان سے پتھر برسنے لگے بھاگ بھاگ کر پھر دالان میں پہنچے۔ اب عقل حیران ہے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ جب باغیان غدر نے جا کر میگزین کا محاصرہ کیا ہے۔ تو یہ چند مردمان یورپین میگزین میں موجود تھے۔ اکثر عورتیں اور بچے بھی وہاں پناہ گزین تھے۔ پہلے تو محصوران مجبور بمقابلہ پیش آئے اور حفاظت اختیاری کے طور پر بندوقیں سر کرتے رہے اور جب بلوائیان کا غلبہ حد سے گزر گیا اور چار دیواری میگزین کے اطراف و جوانب میں لگ پھر گئے اور کوئی صورت جان بچانے کی نظر نہ آئی اور زندگانی سے یاس کامل ہو گئی تو بموجب اس مثل کے مرتا کیا نہ کرتا، جان شیریں سے ہاتھ دھو کر مرنے پر کمر باندھی۔ ناچار آپ ڈوبوں گا مگر تم کو بھی لے ڈوبوں گا، پر عمل کیا اور کارتوس کے تہ خانے میں جا کر ان کا توڑوں کو آگ دے دی۔ آپ بھی اڑ گئے اور ایک ہزار کے قریب کو ہمراہ لے کر راہی ملک عدم ہوئے۔ پچاس گز دیوار شہر پناہ کی اڑ گئی۔ جس قدر آدمی ڈنڈی پر بیٹھے اڑ گئے۔ کچھ تو اس طرح ضائع ہوئے اور اکثر صدمات سنگساران سے سنگسار ہوئے۔"

قیدیوں کا قتل

"ایک دن صبح کا وقت ہے۔ کوئی گھڑی بھر دن چڑھا ہوگا۔ میں گھر سے نکل کر قلعہ کی طرف روانہ ہوا اور نقار خانہ میں پہنچ کر دیوان عام کے نزدیک پہنچا۔ وہاں مجھے خیال آیا کہ خانساماں میں چل کر حکیم جی سے ملتے ہیں۔ شاید حضور میں کچھ احکام صادر ہوئے ہوں۔ اس خیال سے جالی کا راستہ چھوڑ کر خانساماں کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ جب مہتاب دروازہ کے آگے پہنچا۔ دیکھا کہ پوربیے ان قیدیوں کو باغ میں لے کر آتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ تم ان کو کہاں لے جاتے ہو۔ وہ بولے ہم ان کو قلعے کے باہر لے جا کر رکھیں گے۔ پھر میں نے کہا کہ یہ تو ہماری تحویل میں ہیں۔ تم ان کو نہ لے جاؤ مگر وہ کب سنتے تھے۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ مبادا یہ کوئی اور حرکت ہی کر بیٹھیں۔ میں قدم بڑھا کر جلدی سے احسان اللہ خان کے پاس پہنچا۔ وہ خانساماں کے کوٹھے پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے جا کر ان سے کہا کہ خان صاحب آپ کو کچھ اور بھی خبر ہے۔ وہ بولے کیا؟ میں نے کہا کہ پوربیے ان قیدیوں کو لیے جاتے ہیں۔ مبادا وہ ان کو لے جا کر قتل کر ڈالیں آپ اس کا بندوبست کیجیے تو مجھے جواب دیا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ خان صاحب وقت نمک حلالی کا یہ ہے کہ اگر بادشاہ کو بچانا چاہتے ہو تو سمجھا بجھا کر ان قیدیوں کو بچا لو ورنہ یاد رکھو انگریز لوگ دلی کا چبوترہ بنا دیں گے۔ احسان اللہ نے جواب دیا کہ میاں تم بچے ہو، تم کیا جانو، ابھی جو ہم ان سے کہتے ہیں تو یہ ان سے پہلے ہمیں قتل کر دیں گے اور پیچھے ان پہ ہاتھ ڈالیں گے۔ پھر میں نے جواب دیا۔ اچھا ہے اگر ہم دو چار آدمی مارے جائیں۔ مگر بادشاہ کی سرکار تو بچ جائے گی۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے روانہ ہوا اور ڈیوڑھی پر آیا۔ خواجہ سرا سے عرض کرائی کہ پوربیے انگریزوں کو نکال کر لے گئے ہیں جن کو حضور نے بڑے خاصے میں رکھا تھا۔ بادشاہ

نے اسی وقت حکم دیا کہ حکیم جی کو لاؤ۔ وہ اس کا بندوبست کریں۔ خواجہ سرا نے اندر سے آکر ہرکارے کو دوڑایا کہ جلدی حکیم جی کو لے کر آؤ۔ غرض ایک ہرکارہ، تھوڑی دیر کے بعد دوسرا گیا پھر تیسرا ہرکارہ روانہ ہوا۔ اس عرصہ میں گھڑی ڈیڑھ گھڑی کا زمانہ گزر گیا حکیم جی کسی طرح سے وہاں سے نہ ملے۔ بعد ڈیڑھ گھڑی کے حکیم جی تسبیح خانہ پہنچے اور اندر محل میں حضور کے پاس پہنچے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ تم افسروں کو بلا کر سمجھاؤ اور ان لوگوں کو بچالو۔ غرض کہ بہت اچھا کہہ کر باہر آئے اور دیوانِ خاص میں آکر بیچ کے در میں کٹہرے سے لگ کر ہو بیٹھے اور شاید ایک دو آدمی افسروں کے بلانے کو بھیجا کہ ناگہاں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ لعل پردہ کے دروازہ سے دو کمپنیاں پوربیوں کی بندوقیں کاندھے پر رکھے ہوئے چلی آتی ہیں۔ اور آتے ہی انہوں نے دیوانِ خاص میں گھس کر ہم لوگوں کا محاصرہ کیا اور بندوقوں کے پائے چڑھا کر ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت ہم لوگ خدا کو یاد کرتے تھے اور سب بیٹھے ہوئے کلمہ پڑھ رہے تھے۔ ہم کوئی دس بارہ آدمی کے قریب تھے۔ ہم کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب لمحہ دو لمحہ میں یہ ہم کو اڑا دیں گے۔ گھڑی بھر تک یہ کیفیت رہی۔ بعد دو سواروں کے ہاتھ میں سرخ رومال لعل پردے کے دروازہ سے رومال کا جھلا رہا۔ ان سپاہیوں نے جو ہم پر بندوقیں بھرے ہوئے کھڑے تھے۔ انہوں نے بندوقوں کے پائے اتار دیئے اور کاندھے پر رکھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہرکارے نے آن کر خبر دی۔ ان قیدیوں کا کام تمام کر دیا گیا۔ یہ سن کر مجھ کو اس درجہ صدمہ ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ جس قدر مجھے اپنی اولاد کے مرنے کا غم ہوا۔ اسی کے برابر ان بچوں کے مارے جانے کا الم ہوا۔ میں حیران ہوں کہ وہ کیسے سنگدل تھے کہ جن نے ان بچوں پر ہاتھ اٹھایا۔ اس وقت وہاں سے اٹھ کر گھر آیا۔

جب نقار خانہ کے دروازہ میں آیا تو میں نے دیکھا کہ دروازے کے بائیں جانب کو وہ کٹے ہوئے پڑے تھے۔ مجھ سے یہ حال نہ دیکھا گیا اور منہ پر رومال ڈال کر چلا آیا۔ حوض کے برابر میرا چاکر گھوڑا لیے ہوئے کھڑا تھا۔ میں گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا تو حواس منتشر تھے۔ میرے والد نے دریافت کیا۔ خیر باشد آج ایسا پریشان کیوں ہے۔ میں نے وہ ماجرائے قیامت انگیز بیان کیا۔ اس واقعہ ناگزیر کو سن کر وہ بھی افسوس کرنے لگے۔ فرمانے لگے۔

"تیرے نامہ اعمال میں تو جزائے خیر اس کی تحریر ہوگئی، مگر ان بے گناہوں کی قضا تھی مشیت ایزدی یونہی تھی۔"

اس واقعہ کے بعد کی یہ کیفیت ہے کہ شہر میں پوربیوں کا راج ہو رہا تھا۔ جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ اندھیر نگری چوپٹ راج۔ اندھے کی داد فریاد۔ رعیت کا ناک میں دم تھا۔ خدا سے دست بدعا تھے کہ خداوندا اس بلائے ناگہانی کو جلدی دفع کر۔ یہ کم بخت پوربیے کہیں شہر سے نکلیں تو قصہ پاک ہو۔ یہ لوگ شہر کی دکانوں اور بنیوں کو لوٹ کر مالا مال ہو رہے تھے۔ روپیہ رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ روپوں کی اشرفیاں کرا کر کمروں میں باندھ رکھی تھیں اور اشرفیوں کا بھاؤ ایسا گراں ہوا تھا کہ تیس روپیہ کو ملتی تھی اور رعایا بھوکی مرتی تھی۔ تمام کارخانے بند تھے اور اہل حرفہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔"

انگریزی فوج کی آمد

"پورے بارہ کا وقت تھا کہ توپ کی آواز کان میں آئی احتمال ہوا کہ دوپہر کی توپ چلی ہے اور ایک منٹ بعد دوسری توپ سر ہوئی۔ ہاں دوپہر کی توپ نہیں جنگ کی توپ ہے۔ لڑائی شروع ہوگئی ہے۔ اب برابر توپ کے فائر ہونے لگے۔ لگاتار توپ کی آواز چلی آتی تھی۔ پھر یک بارگی باڑھ کی آواز آنے لگی۔ اب توپ بھی چل رہی ہے اور بندوقوں کی باڑیں جھڑ رہی ہیں۔ دو گھنٹہ کامل یہ صدا آتی رہی۔ بعد توپ اور بندوق بند ہوئی اور فیٹ فیر کی آواز متفرق آنے لگی۔ اب مقام حرب قلعہ سے بارہ تیرہ میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ اور دن کے تین بج گئے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دو گھنٹے کے عرصے میں ڈبل کوچ کر کے پہنچ گئے۔ اور لڑائی شروع ہوئی اور تین گھنٹہ میں فیصلہ ہو گیا۔ ابھی فتح شکست کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ کون جیتا اور کون ہارا۔ اس کا انتظار ہے۔ غرض پانچ بجے کے قریب میں قلعہ سے سوار ہو کر جاتا ہوں۔ جب لاہوری دروازے کے چھتے میں پہنچا تو مجھے فوج واپس آتی ہوئی ملی۔ آگے آگے توپ خانہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جوان میگزین کی کراچی پر صندوق سے لگا ہوا بیٹھا ہے۔ مگر بے ہوش۔ آنکھیں بند ہیں۔ میں سمجھا زخمی ہے۔ گھوڑوں پر جو بیشتر سوار تھے میں نے ان سے پوچھا کہ اس کے زخم کہاں آیا ہے؟ انہوں نے کہا۔ زخم نہیں آیا۔ اس کو ٹھنڈا گولہ لگا ہے اس کے صدمے سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ سوار اور پیدل ہنستے کودتے ہیں۔ باجہ بجاتے چلے آتے ہیں۔ قلعہ کے دروازے میں سے نکل کر میں نے ایک سوار سے پوچھا کہ تم اتنی جلدی کیوں کر واپس چلے آئے۔ اس نے بیان کیا کہ ہماری فتح ہوگئی۔ گورے مقابلے پر سے بھاگ گئے۔ ہم واپس چلے آئے۔ پھر میں نے پوچھا کہ لڑائی کی کیا شکل ہوئی۔ اس نے بیان کیا کہ ندی کے اس پار ہم تھے اور اُس پار وہ تھے۔ جانبین سے توپیں چلتی رہیں ہمارے توپ خانے نے بڑا کام کیا۔ آدمی آدمی کے پیچھے گولہ لگا رہا۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ گورے دھوپ کی تیزی اور حرارت آفتاب کی تاب نہ لا سکے ہم دور سے دیکھتے تھے کہ وہ ندی کے پانی کے اندر کھڑے تھے اور ان کے گھٹنوں تک پانی تھا۔ جب ہمارے سواروں نے دھاوا کیا تو وہ کلبلا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن اپنی توپیں وغیرہ سب اپنے ساتھ لے گئے۔

دوسرا معرکہ

"یہ بہت بڑی خونخوار جنگ تھی۔ غازی آباد کے بعد ایک مہینے بھر تک کچھ لڑائی بھڑائی کا ذکر تک نہیں ہے۔ پوربیے خوب بھنگیں پیتے ہیں اور لڈو پیڑے کھاتے ہیں۔ پاؤں پسار کر نیند بھر سوتے ہیں۔ چاروں طرف سے مدد چلی آرہی ہے۔ لکھنؤ کا رسالہ آگیا اور جالندھر والی پلٹن کے جوان بھاگ کر چلے آئے اب قریب دس بارہ ہزار کی جمعیت پیدل سوار جنگی کی فراہم ہو گئی ہے۔

سولہویں رمضان کی، ڈیڑھ ماہ کے بعد ایک دن پانچ بجے دن کے میں گھوڑے پر سوار قلعے سے گھر آتا ہوں تو قلعے کے چھتے میں مجھے دو سوار نیلی وردی کے ملے اور ان کی نیلی جھنڈیاں تھیں۔ مجھے بظاہر ان کی وجاہت اور چال کرنج سے معلوم ہوا تھا کہ شاید کسی رسالے کے افسر ہوں، مسلمان تھے۔ صاحب سلامت ہوئی چونکہ ان کی وردی کا کوئی اور سوار میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ شاید نئے سوار ہیں۔ میں نے پھر پوچھا۔ تم کون سے رسالے کے سوار ہو۔ انہوں نے بیان کیا چوتھے رسالے کے۔ میں نے کہا۔ چوتھا رسالہ تو یہاں کوئی نہیں۔ سواروں نے کہا۔

"چوتھا رسالہ انگریزوں کی لشکر بندی میں ہمراہ آیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ انگریزوں کی فوج کہاں ہے؟ سوار بولے — علی پور میں — میں نے پوچھا "علی پور سے تم کیوں چلے آئے"۔ جواب دیا —

"ہم نگاہ بچا کر چلے آئے اور اپنے بھائی بند فوجیوں کو اطلاع دینے آئے ہیں کہ حملے کے وقت ہم تم میں آملیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تم ہم کو آتے ہوئے دیکھ کر گوروں کے شبہے میں گراب مار کر اڑا دو۔ ذرا اس بات کا خیال رکھنا"

پھر سواروں نے مجھ سے پوچھا کہ "فوج کے افسر کس طرف ہیں"۔ میں نے بتایا کہ تم چھتے میں سے نکل کر بائیں ہاتھ کی جانب ترپولیہ سے اور نہر سے ادھر سیدھے چلے جاؤ۔ آخر کو قلعہ کا دروازہ آئے گا اور پرانا پل جمنا کا۔ اس کے اُوپر سے گزر کر سلیم گڑھ کا دروازہ آئے گا۔ اس دروازہ کے اندر چلے جانا وہ سب افسر تم کو موجود ملیں گے۔ غرض کہ وہ تو ادھر کو گئے اور میں گھر کو روانہ ہوا۔ تھوڑی دیر گزری تھی شام کے چھ بجے تھے کہ تیاری کا بگل ہوا اور فوج کی کمر بندی ہوگئی۔ میں سب کو ایک دوست کے کوٹھے پر بیٹھا ہوا یہ تماشہ دیکھ رہا

تھا۔ چاندنی رات تھی کوئی پانچ گھڑی رات گئے یہ سب فوج باہر ہو گئی۔ بڑی توپیں تو انہوں نے پہاڑی پر چڑھا کر مورچے باندھ لیے۔ آٹھ دس توپیں وہاں چھوڑیں اور کوئی دو ہزار کی جمعیت تو وہاں اس مورچے پر رہی۔ باقی کل فوج علی پور پہنچ گئی۔ انہوں نے مورچہ بندی کر لی۔ رات تو انہیں مورچہ بندیوں میں گزری۔ پوربیوں نے بڑی توپیں اپنے بائیں بازو پر رکھی تھیں۔ چار گھڑی رات باقی تھی کہ توپیں چلنی شروع ہو گئیں۔ سننے میں آیا ہے کہ ان کی بڑی توپوں نے بڑا کام دیا، اور انگریزی فوج کا بہت نقصان ہوا۔

اب نماز کے وقت سے پہلے سولجروں کے رسالے نے ان بڑی توپوں پر حملہ کر دیا۔ ان کے پاس نیلی جھنڈیاں اور نیلی وردیاں تھیں۔ ان کو یہی دھوکہ ہوا کہ شاید یہ وہی چوتھا رسالہ ہے جس کے پیچھے ہم سے آکر شام کو کہہ گئے تھے کہ وقت جنگ میں ہم تم میں آکر شامل ہو جائیں گے۔ انہوں نے ان پر فیر نہیں کیا۔ یہ دھوکہ کھا گئے اور وہ جب قریب معلوم ہو گیا کہ بلا برو کے سوار ہیں تو انہوں نے تین توپوں میں گراب ڈالا، اور وہ قریب آگئے تھے۔ جب فیر کیے اس وقت راوی کا بیان ہے کہ سوار گھوڑوں کا یہ حال ہوا کہ جس طرح نداف روئی دھنتا ہے اور روئی کے ریشے اڑ اڑ کر زمین پر گرتے ہیں۔ سوار اور گھوڑے اڑ اڑ کر گرے اور گوروں نے پھر ہست کھایا۔ آخر دست بدست جنگ ہونے لگی۔ انگریزوں نے توپوں پر قبضہ کر لیا اور وہی توپیں اب پوربیوں پر فیر کرنے لگیں۔

آٹھ بجے کا عمل ہو گا۔ میں قلعہ میں اپنی نوکری پر جاتا تھا۔ جب جوہری بازار کے پھاٹک سے سڑک پر آیا ہوں تو میں نے دیکھا کہ زخمی بکثرت شہر میں آرہے ہیں۔ ایک ایک زخمی کے ہمراہ تین تین چار چار پوربیے لپٹے ہوئے اور اسے لیے چلے آتے ہیں۔ سڑک پر خون گرتا چلا جاتا ہے۔ تمام سڑک گل رنگ ہو رہی ہے۔ دو سوار میرے برابر سے نکلے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے سینوں پر گولیاں لگی ہوئی ہیں اور چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے اور پشت پر زخم کھلے تھے۔ ایک گھوڑ سوار کو بگٹٹ گھوڑا دوڑائے آتے دیکھا۔ گھوڑے کی پیشانی پر گراب کے کاری زخم تھے۔ اس کے پیچھے ایک زخمی کو دیکھا کہ ہاتھ اس کا اڑ گیا تھا۔ قلعے تک پہنچتے پہنچتے بیشمار ایسے زخمی ملے۔ جب میں پہنچا تو حکیم احسن اللہ خان اور محبوب علی خان خواجہ سرا اور چند اور ملازمین شاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑائی کا ذکر ہو رہا تھا۔ مگر مفصل کیفیت کسی کو معلوم نہ تھی کہ نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ اسی اثنا میں گیارہ بج گئے اور محبوب علی خان اور احسن اللہ خان کھانا کھانے کے واسطے اپنی نشست گاہ میں اٹھ کر چلے گئے۔ میں بھی کھانا کھانے کے واسطے گھر کو روانہ ہوا۔ جب میں نقار خانے کے دروازے پر پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ چند پوربیے ایک شخص کو پکڑے ہوئے لیے آتے ہیں اور ایک افسر توپ خانہ باغیہ میرے برابر برابر دیوان عام میں سے چلا آتا ہے۔ جب یہ دونوں میں دروازہ میں باہم دو چار ہوئے پوربیوں نے اس افسر سے کہا کہ یہ قیدی انگریزی چوتھے رسالے کا سوار ہے حملے کے وقت ہمارے سواروں میں گھر گیا تھا۔ ہم اسے پکڑ لائے ہیں۔ اس افسر نے شخص گرفتار شدہ سے کچھ پوچھا نہ گچھا۔ اس کی کمر میں ولایتی اصفہانی تلوار تھی۔ کھینچ کر اس پر پے در پے وار کرنے شروع کر دیئے چونکہ وہ میرے برابر ہی میں تھا۔ میں گھبرا کر چبوترے پر چڑھ گیا۔ اس افسر نے تین وار تلوار کے اس کے منہ پر کیے مگر خدا جانے کیا بات ہوئی کہ مقتول کے جسم پر خط تک نہ آیا۔ پوربیا بولا اسے ہنکا دو۔ غرض وہ چھوٹ گیا اور دلی دروازہ کی ترپولیہ کی طرف فرار ہوا۔ عقب سے ایک پوربیے نے گولی ماری اور وہ اوندھے منہ زمین پر گرا۔

میں وہاں سے سرفراز ہو کر قلعے کے دروازے سے نکل کر اردو بازار سے ہوتا ہوا اخلی دروازہ کے برابر سے کوتوالی کے آگے سے ہوتا ہوا اشرف بیگ کے کمرے کے نیچے پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دو ڈھائی سو کے قریب سوار بحال خراب چہروں پر گرد پڑی ہوئی اور وہاں سب گرد میں اٹی ہوئیں، گھوڑے پسینے میں نہائے ہوئے، اور خون کے سانے ہی کھڑے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شکست خوردہ سپاہی ہیں اور گوروں نے ان کی توپوں پر قبضہ کر لیا ہے۔

صبح کے آٹھ بجے نصیر آباد کی فوج دلی میں سے تیار ہوئی اور بہت سا میگزین ہمراہ لیا اور چھاؤنی کے راستے پر ستہ راہ ہوئی۔ بارہ بجے دن اس کا مقابلہ انگریزی فوج سے ہوا۔ ایک دوسرے پر گولہ باری ہونے لگی توپوں کی آوازیں آنے لگیں۔ باغیاں کے پاؤں اکھڑ گئے۔

جرنیل بخت خان کی آمد

اس معرکہ آرائی کے بعد جرنیل بخت خاں چودہ ہزار کا کیمپ اور توپ خانے اور دو تین رجمنٹ سواروں کی اور کئی لاکھ روپیہ خزانہ بریلی سے لے کر دہلی میں وارد ہوا۔ بخت خان کے آنے کے بعد بیس روز لڑائی بند رہی۔ پھر سب جرنیلوں نے مل کر طے کیا کہ پہاڑی کے عقب میں چل کر انگریزوں کا محاصرہ کرنا چاہیئے۔ بخت خان اپنی فوج کو لے کر روانہ ہوا۔ شہر سے چار پانچ کوس کے فاصلے پر جا کر نہر کے اس جانب ڈیرہ ڈال دیا۔ دوسرے روز سوہاری سنگھ اور غوث محمد خان اپنی فوج کو لے کر روانہ ہوئے۔ جب بخت خان کے لشکر کے ساتھ ملے تو انہیں خطرہ ہوا کہ اگر انگریزوں نے نہر کا پل اڑا دیا تو وہ پھنس جائیں گے چنانچہ فوج نے نہر کے دوسرے کنارے پر جا کر ڈیرہ لگایا۔ اتفاق سے بارش شروع ہو گئی۔ اس شدت سے پانی برسا کہ جنگل میں پانی پانی ہو گیا۔ توپیں پانی میں غرق ہو گئیں۔ ادھر انگریزی فوج نے آگے گولے اور گراب کا مینہ برسانا شروع کر دیا۔ نہر کا پل اڑا دیا گیا۔ ادھر سے بخت خاں کی فوج نے انگریزی فوج پر گولہ باری شروع کر دی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ ہزارہا جانیں تلف ہو گئیں۔ بخت خاں اپنا لشکر لے کر واپس شہر میں آگیا۔

بارود خانہ اڑا دیا گیا

بخت گڑھ کی لڑائی کے بعد پوربیوں کی ہمت ٹوٹنے لگی تھی اور جوش و خروش کم ہو گیا تھا۔ اسی اثنا میں ایک ستم اور ہوا کہ چوڑی والوں کے محلے میں شمرو کی بیگم کی حویلی میں میگزین تھا اور وہاں بارود تیار ہوا کرتی تھی اور سات سو من بارود روزانہ بنتی تھی اور خرچ میں آجاتی تھی۔ ایک دن تیسرے پہر دن کے تین بجے ہوں گے کہ یکایک ایک دھمک کی آواز کان میں آئی گمر دھم کہ ایسا ہوا جیسے سو توپ کے برابر اس کی صدا تھی۔ میں اپنے مکان کے دوسرے منزلہ پر چڑھ گیا اور چار طرف نگاہ کی۔ اپنے مکان کی جنوب کی جانب دیکھتا کیا ہوں کہ دھواں اور گرد و غبار اڑ رہا ہے۔ میں نے آدمی کو بھیجا کہ جا کر خبر لاؤ کیا واردات گزری۔ آدمی نے تھوڑی دیر میں آکر اطلاع دی کہ میگزین میں سات سو آدمی کام کرتے تھے سب اڑ گئے۔ لاشوں کا ڈھیر پڑا ہے۔ مکان میں آگ لگ رہی ہے اور کثیر ہجوم خلق اللہ کا ہے۔ ایک حشر برپا ہو رہا ہے۔ ہزاروں آدمی واویلا مچا رہے ہیں جن کے عزیز و اقربا بارود خانہ میں کام کرتے تھے، یہ منظر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔

شب خون

اس واقعہ کو تھوڑے دن گزرے تھے کہ ایک دن یہ معاملہ پیش آیا کہ کشمیری دروازہ کے باہر نصف میل کے فاصلے پر ایک پہلی کوٹھی پہاڑی کے متصل تھی، وہاں پوربیوں نے ایک مورچہ قائم کر رکھا تھا اور وہاں بڑی بڑی توپیں لگا رکھی تھیں۔ ان توپوں سے انگریزی فوج کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ اس مورچے کی حفاظت کے واسطے ہر وقت دو پلٹنیں اور گولہ انداز موجود رہا کرتے تھے اور دو پہر کی نوکری رہا کرتی تھی۔ ایک دن حسب اتفاق دن کے بارہ بجے نصیر آباد والی فوج نے نیمچ والی فوج سے کہا کہ بھائیو ہوشیار رہنا، رات کا سماں ہے ایسا نہ ہو کہ غنیم اگر چھاپہ

جائے اور تم غافل ہو جاؤ۔ ان پوربیوں نے جواب دیا۔

" بھیّن! تم سپاہی ہو ہم سپاہی نہیں "

غرض یہ تو وہاں سے رخصت ہوئے اور پوربیوں نے مورچہ سنبھال لیا۔ وہ بھنگ پی کر رات کو سو گئے اور تن بدن کی بھی ہوش نہ رہی۔ ادھر مخبر نے جا کر انگریزی فوج کے جرنیل کو خبر کر دی کہ دشمن خوابِ خرگوش میں مدہوش پڑا ہے۔ مورچہ سونا پڑا ہے۔ یہ وقت شب خون مارنے کا ہے۔ وہاں سے افسرانِ فوج پلٹنوں کو لے کر ننگے پاؤں پہاڑی سے اتر کر آگئے۔ پہلے تو انہوں نے بندوقوں پر قبضہ کیا پھر توپوں پر قبضہ کر لیا اور بعد ازاں پوربیوں کو بیدار کیا اور انہیں کہنا شروع کیا۔

" اٹھو بھائی دین دارو، گورے لوگ آگئے"۔

ایک جو آنکھ ملتا ہوا اٹھا، گورکھے نے کھکری مار کر سر اڑا دیا۔ اب کھکری اور تلوار چلنا شروع ہو گئی۔ ایک شورِ قل آ ہا ہو کا بلند ہوا۔ جتنے مارے گئے مارے گئے باقی بدحواس ہو کر شہر کی جانب بھاگ گئے۔ ادھر نصیر آباد کی پلٹنیں کشمیری دروازے کے باہر پڑی تھیں۔ یہ بھاگے ہوئے ان کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ان پوربیوں کو لعنت ملامت کے بعد کہا کہ تم جلے پیچھے آجاؤ اور بندوقیں بھر کر خاموش لیٹ گئے۔ اسی اثنا میں انگریزی فوج ان کا پیچھا دبائے پہنچی کہ ان کے ساتھ ہی شہر کے اندر داخل ہو جائیں گے۔ بے خبر پلٹنیں سامنے چلے آتے تھے جب یہ بندوق کی زد پر آن پہنچے تو یک بارگی انہوں نے باڑھ ماری۔ کشمیری دروازہ کے گولندازوں نے جو یہ دیکھا کہ شہر کی ڈنڈی کے نیچے ہی لڑائی ہو رہی ہے تو انہوں نے اوپر سے گراب مارا۔ اُدھر سیاہ برج والوں نے توپیں بھر کر اندھا دھند گراب برسانے شروع کر دیئے لاش پر لاش پڑی ہے۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ بھاگے اُلٹے پاؤں اور مورچوں میں جا کر دم لیا اور توپوں کے رخ شہر کے دروازے کی طرف پھیر کر اندھا دھند گولہ باری کرنی شروع کر دی۔ رات بھر دونوں طرف سے توپ بندوق چلتی رہی۔ مگر وہ مورچہ کافروں کے ہاتھ سے نکل گیا اور گوروں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اب باہر سے بھی امداد پہنچ گئی۔ آمنے سامنے کی لڑائی ہو گئی۔

سیاہ برج کا نیا مورچہ

اس لڑائی کے بعد انگریزی فوج نے یہ کام کیا کہ جو مورچہ ان سے چھینا تھا۔ اس کو خوب مستحکم کیا اور وہاں پڑاؤ ڈال دیا اور رفتہ رفتہ شہر کی جانب مورچہ بڑھانا شروع کر دیا جو سڑک کشمیری دروازہ کو جاتی تھی وہاں ایک لکڑی والے کی ٹال تھی۔ وہاں بلیّاں اور چھتوں وغیرہ کی کڑیوں کا انبار پڑا رہتا تھا۔ اور ایک برج دروازے کے سیاہ برج کے متصل واقع تھی۔ ایک شب انگریزی فوج نے یہ کام کیا کہ اس ٹال میں آگ لگا دی کڑیوں کو سلگا دیا۔ اس میں سے دھواں اٹھنا شروع ہو گیا۔ اس دھوئیں کی اوٹ میں گورے مورچہ باندھنے لگے۔ غرض کہ جب مورچہ تیار ہو گیا تو چالیس توپیں قلعہ شکن اس میں لا کر رکھ دیں کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ پھر ایک بارگی ان چالیس توپوں کا فیر سیاہ برج پر کیا۔ اور ان توپوں کی برابر سیاہ برج پر باڑھ جھاڑنی شروع کر دی۔ اس وقت سیاہ برج والوں کی آنکھیں کھلیں۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ ہر چند ہاتھ پاؤں مارے، گراب مارے مگر کیا ہوتا ہے۔ اُدھر سے برابر توپ کی باڑھ پڑ رہی تھی۔ اب یہ کیفیت ہو گئی کہ سیاہ برج کی زدوں کی جھانکیں اور پشتے رک سے گئے اور جس کی پناہ میں کھڑے ہو کر توپ لگاتے تھے، وہ گرنے شروع ہو گئے اور توپوں پر گولہ پہنچنے لگا اور سیاہ برج پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ انجام یہ ہوا اس کا سب عملہ کھائی میں گر گیا۔ آٹھ دن تک یہ گولہ باری شبانہ روز جاری رہی۔ آخر آٹھویں روز جب انگریزی سپاہ نے دیکھ لیا کہ سیاہ برج خالی پڑا ہے اور کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے اور سیاہ برج پر سے اچھی طرح آدمی چڑھ سکتے ہیں تو چار گھڑی رات پچھلے پہر سے تمام فوج انگریزی پہاڑی پر سے اتر کر بیرم خان کے کھنڈروں میں آگئی اور کابلی دروازے کے اُس جانب لا کر توپ خانے لگا دیئے۔ اس طرف سے بھی تمام فوج باغیہ کل سوار پیدل توپ خانے لے کر مقابل ہوئی۔ یہ لاہوری دروازے سے لگا کر کابل دروازہ کی نہر تک تمام تیل واڑہ کے میدان میں پھیلی ہوئی تھی۔ انگریزی فوج کے اور اس کے درمیان میں فقط ایک نہر حائل تھی۔ برابر دونوں طرف سے بندوق کی باڑھ جھڑ رہی تھی اور پہاڑی کے مورچوں کی توپیں اور دستی توپ خانے داغ رہے تھے۔ پوربیوں کی طرف سے لاہوری دروازہ کے برج کی توپیں چل رہی تھیں۔ گولہ، گراب اور باڑھوں کا دونوں طرف سے مینہ برس رہا تھا۔ اس دن شہر کی زمین اور مکانات اور سب مدو دیوار لرز رہے تھے۔ خدا جانے طرفین سے تین سو توپ چل رہی تھی۔ یہ کیفیت صبح پانچ بجے سے شروع ہوئی اور رات دس بجے تک جاری رہی۔ آٹھ بجے دن کے میں پانچ چھ آدمی لے کر قلعے کی جانب جانے لگا تو دیکھا کہ کوچہ بندی کے سب پھاٹک بند ہیں۔ دروازوں کو قفل لگے ہوئے ہیں۔ مگر کھڑکیاں سب کھلی ہوئی تھیں۔ میں چھوٹے دریبے کے پھاٹک سے نکل کر چلنے لگا تو دیکھا۔ دو چار آدمی ادھر سے واپس آتے ہیں۔ ان میں ایک بادشاہی دربان بھی ہے اس نے مجھ سے پوچھا۔ کہاں جاتے ہو؟ میں نے کہا قلعے کو۔ اس نے مجھے منع کیا کہ نہ جاؤ قلعہ کا دروازہ بند ہے۔ میں واپس آیا ہوں۔ اس وقت بازار کی سب دکانیں بند تھیں اور ایک دو آدمی چلتے پھرتے تھے۔ میرے جی میں آئی کہ تم تو چل کر دیکھو کیا معاملہ ہے۔ جب قریب دروازہ پہنچا دیکھا دروازہ بند ہے اور قفل لگا ہوا ہے اور دروازے کے آگے ایک توپ لگی ہوئی ہے۔ کچھ آدمی دروازے کے پیچھے کھڑے ہوئے ہیں اور دروازے کے اوپر ایک حوالدار کھڑا ہوا لڑائی کا حال بیان کر رہا ہے اور لوگ سن رہے ہیں۔ اسی اثنا میں ایک رجمنٹ سواروں کی قلعے کی جانب سے آئی اور انہوں نے دروازے والوں سے کہا تم دروازہ کھول دو۔ ہم باہر جائیں گے۔ دروازے والوں نے دروازہ نہ کھولا۔ اور حوالدار نے ادھر سے بیان کیا کہ تم لوگ کشمیری دروازہ کو جاؤ۔ ادھر کی طرف غلبہ بہت ہے اور اے لو تمہارے ہاں کے سواروں نے ادھر کو حملہ کر دیا۔ مٹھائی کے پل پر سے اس جانب چلے آ رہے ہیں اور انگریزی سپاہ کشمیری دروازہ کی طرف دوڑی جا رہی ہے۔

ان سواروں نے لاہوری دروازہ کی ڈنڈی کے پیچھے پیچھے جو راستہ کابلی دروازہ کو جاتا تھا ادھر کو گھوڑے دوڑا لیے۔ میں نے اپنے گھر کا رُخ کیا۔ جب میں بھوانی شنکر کے چھتے کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ لو رہیئے بے تحاشا بھوانی شنکر کے چھتے میں سے بھاگے چلے آتے ہیں۔ اس وقت بہت سے آدمی بازار میں تھے۔ انہوں نے ان کو روکا کہ میں تم ہم کو لڑوا کر کہاں جاتے ہو؟ —— تو انہوں نے بندوقیں اور توشہ دان پھینک کر کہا۔

" بھیّن! ہم تو لڑ چکے اب تم ہی لڑو"۔

اور یہ کہہ کر بندوقیں پھینک کر بھاگ گئے۔ جب یہ حال لوگوں نے دیکھا تو سب اپنے اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔ میں قدم اٹھا کر تِلی ماروں کے پھاٹک میں پہنچا تو دروازہ بند پایا۔ دوڑ کر چھوٹے دریبے کے پھاٹک تک پہنچا۔ بارے وہ دروازہ بند تھا مگر کھڑکی کھلی ہوئی تھی اس وقت ایک تماشہ اور نظر آیا۔ جب میں کھڑکی کے پاس پہنچا ہوں تو سامنے کوتوالی کے آگے سے ایک بندوقوں کی باڑھ مجھ پر پڑی اور گولیاں آ کر سڑک کی نالیوں میں کے پتھروں سے چٹخیں، جس طرح زمین پر اولے گرتے ہیں۔ میں نے سامنے دیکھا تو انگریزی فوج کا ایک دستہ کوتوالی کے آگے موجود کھڑا تھا۔ میرے ہمراہیوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ میرے گولی لگی ہے۔ میں نے کہا آؤ چلے آؤ۔ گھر چل کر دیکھیں گے اور جلدی سے کھڑکی میں

داخل ہو کر اس شخص کو کھینچ کر کھڑکی کے اندر لے لیا۔ سب ہمراہی جب اندر آگئے تو کھڑکی بند کر دی اور قدم اٹھا کر گھر کا راستہ لیا اور بھاگ کر گھر پہنچا۔ وہاں جا کر اس سے دریافت کیا کہ تیرے گولی کہاں لگی ہے، اس نے جواب دیا کہ پیٹ میں اور اپنی کمر کھولی تو کھٹ سے گولی تخت پر گری۔ اس کو اٹھا کر دیکھا تو لمبی اور پیچھے سے چھالیا کی ڈلی کی صورت تھی۔ اس شخص کے گلے میں ایک چار انگل چوڑا چمڑا تھا اُسے جلا کر زخم پر باندھا۔

میں اپنے گھر میں آگیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ پوربیے بھاگ گئے ہیں اور انگریزی فوج شہر کے اندر داخل ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے اب قتل عام ہونے والا تھا۔ میں نے گھر میں کسی سے کوئی بات نہ کی۔ ایک ڈیڑھ گھڑی دن گزرا ہوگا کہ یکایک توپ کی صدا میرے کان میں آئی اور اتنی قریب معلوم ہوئی کہ گویا اس محلہ میں چل رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور آواز آئی جب تو مجھے حیرت ہوئی کہ محلے میں یہ توپ کہاں سے آگئی؟ پھر میں دو تین آدمیوں کو ہمراہ لے کر گھر سے نکلا۔ محلے میں جو سڑک تھی وہاں پہنچا تو دیکھا کہ آدمیوں کی آمد و رفت برابر ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھا کہ بھئی کیا ہوا؟ انگریزی فوج کہاں گئی؟ انہوں نے کہا کہ لوگوں نے انہیں مار بھگایا اور شہر میں بلوہ ہو گیا ہے۔ پھر میں وہاں سے چاوڑی کے بازار میں جا پہنچا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ واقعی ہزاروں آدمی لاٹھی، تلوار، گنڈاسا وغیرہ لیے ہوئے شہر میں پھرتے ہیں۔ غرض کہ جامع مسجد کے نیچے ہو کر بازار میں پہنچا تو وہاں عجیب تماشا نظر آیا۔ لاشوں کا ایک ایسا انبار تھا جیسے لکڑیوں کی ٹال لگی ہوتی ہے۔ اور یہ وہ موقع ہے جہاں ایک بار مجھے ایک مست درویش مجذوب نے نشاندہی کی تھی کہ اس جگہ کشت و خون ہوگا۔ بازار کے لوگوں سے دریافت کیا کہ کیا ماجرا ہے۔ لوگوں نے بیان کیا کہ ایک دستہ انگریزی فوج کا مسجد کی سیڑھیوں تک آ پہنچا تھا اور کچھ لوگ فوج کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے۔ اُدھر فوجیوں نے چاہا کہ جامع مسجد میں داخل ہو جائیں۔ مسجد میں جو مسلمان مسافر جمع تھے انہوں نے دیکھا کہ اب یہ خدا کے گھر میں آ کر کشت و خون کریں گے۔ چنانچہ وہ مسجد کے دروازہ سے باہر نکل کر سیڑھیوں پر سے اترنے لگے۔ فوج والوں نے ان پر بندوقیں سر کیں۔ مگر جو زندہ رہے وہ سامنے چلے اور جنگ دست بدست ہونے لگی۔ لوگ گھروں سے تلواریں اور کرچیاں لے کر چل پڑے۔ کچھ مارے گئے۔ باقی بھاگ کر اپنے لشکر کو چلے گئے۔ میں یہ تماشا دیکھتا ہوا بڑے دریبے میں ہو کر خونی دروازہ سے نکل کر کوتوالی کے آگے پہنچا۔ میں نے جامع مسجد سے لگا کر کوتوالی تک لاشیں برابر پڑی دیکھیں اور جس جگہ سے کہ پہلے مورچہ پر بندوقوں کی باڑ پڑی تھی کئی لاشیں وہاں بھی نظر آئیں اور ایک ٹین کی بتیلی گراب کی کوتوالی کے حوض کے آگے پڑی دیکھی۔ وہاں سے آگے بڑھ کر جب میں چھوٹے دریبے کے پھاٹک پر پہنچا ہوں تو میں نے دیکھا کہ پیپل کے درخت کے نیچے ایک توپ کھڑی ہے اور کوئی گولہ انداز وغیرہ وہاں نہیں۔ اس وقت مجھے یقین ہوا کہ یہ توپ وہی ہے جس کی صدا میرے کان تک پہنچی تھی۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ اس توپ کو کھینچ کر لاہوری دروازہ تک لائے اور یہاں قائم کر کے انہوں نے انگریزی فوج پر گراب مارا اور اس سے افواج انگریزی کو جو کوتوالی کے آگے کھڑی تھی نقصان پہنچا۔ کچھ آدمی زخمی ہوئے اور کچھ ہلاک۔ جب دوبارہ گراب مارا ہے اور اس سے زیادہ لوگ ہلاک ہونے لگے تو ان لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اُدھر والے کشمیری دروازے کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے جب یہ حال دیکھا تو چھوٹے دریبے میں ہو کر اپنے مکان کو چلا۔ سنا جاتا ہے کہ پل والے لوگوں نے کشمیری دروازہ اور کچہری میں جا کر پناہ لی۔ شام تک بلوائی تمام شہر میں بلکہ حامد علی خان کی کوٹھی تک پہنچ گئے۔ آگے انگریزی افواج نے توپیں لگا رکھی تھیں۔ یہ جن کے پاس توپ کیا بندوق تک نہیں تھی۔ آگے کیونکر جا سکتے تھے۔ غرض شہر میں شام تک یہ آتش فتنہ و فساد مشتعل رہی۔ شام بھگی بھگائی خلقت اپنے اپنے گھروں میں آ کر پڑ رہی۔ آدھی رات کے وقت سپاہ انگریزی نے یکایک کشت و خون کرنا شروع کر دیا اور سوتے آدمیوں کو گھروں میں گھس کر اور سیڑھیوں کے ذریعے کوٹھوں پر چڑھ کر ہلاک کرنے لگے۔ صبح کے وقت کشمیری دروازہ کے قریب و جوار اور موری دروازہ اور رکابی [illegible] وغیرہ کی خلقت اور ہمان کے پھاٹک کے لوگ بھاگ کر شہر کے اس جانب چلے آئے۔

بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں

منقول کیفیت داخلہ سپاہ انگریزی کی اس طور ہے کہ جس وقت اس حوالدار نے جو لاہوری دروازہ پر کھڑا ہوا پہرا دے رہا تھا کہ انگریزی فوج کشمیری دروازہ کی طرف بڑھ رہی ہے تو دراصل اس وقت فوج نے یورش کی تھی اور سیاہ برج کو خالی پا کر وہاں کوئی آدمی نہ تھا کہ اس یلغار کو روکتا، یہ کھائی میں سے اتر کر سیاہ برج پر سیڑھی لگا کر چڑھ گئے۔ جب سیاہ برج پر چڑھ گئے ہیں تو جاتین کی ڈنڈی پر جو پوربیوں کی فوج کھڑی تھی وہ وہاں سے کود کر بھاگ نکلی اور کابلی دروازہ لگا کر کشمیری دروازہ اور جگہ پور گھاٹ تک سب میدان اور شہر پناہ کا ڈنڈا خالی ہو گیا۔ شہر کے باہر جس قدر فوج کالوں کی تھی سب باہر کی باہر رہ گئی اور باقی شہر کے ڈنڈے والے بھی بھاگ کر شہر کی باہر کی فوج میں جا ملے اور انگریزی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ باہر والے باہر رہ گئے۔ اب شہر میں سوائے رعیت کے پوربیا نام کو نہ رہا۔ سب فوجی اجمیری دروازہ شہر سے لگا کر دلّی دروازے کے باہر تک جا پڑے اور تمام میدان پہاڑ گنج سے لے کر جیل خانے والے دروازے تک جا کر گھیر لیا۔ اب شہر میں دن کو تو شہر والے چلتے پھرتے اور مارنے مرنے پر آمادہ ہیں اور شب کو سپاہ انگریزی نکل کر گھروں میں قتل کر جاتی ہے۔ اب شہر کی یہ کیفیت ہے کہ دکانیں سب بند اور رسد آنی جانی ہے۔ دانہ پانی خلقت پر حرام، لگے بھوک پیاس سے مرنے، تین روز تک یہی کیفیت رہی آخر تیسرے روز شام کے وقت بادشاہ قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے پر پہنچے اور رعیت بھی سراسیمہ و حیران و پریشان ہو کر شب کے وقت سب گھر بار جوں کا توں چھوڑ کر اپنے بال بچوں، عورتوں وغیرہ کا ہاتھ پکڑ کر شہر سے نکلنی شروع ہو گئی غرضیکہ اس وقت وہ قیامت عظیم برپا ہوئی کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔

بہادر شاہ قید میں

ایک دن بعد دلّی دروازہ کھلا اور سانڈرس صاحب نے بیان کیا کہ حضور کے اقبال سے افواج باغیہ کو شہر میں سے خارج کر دیا گیا ہے، اب شہر خالی پڑا ہے۔ حضور تشریف لے چلیں کہ رعیت آباد ہو۔ بادشاہ نے فرمایا کہ اب میں شہر میں چل کر کیا کروں گا۔ شہر سے مجھے کیا مطلب۔ اپنے دادا کے مزار پر آ پڑا ہوں، یہیں بیٹھا رہنے دو جو سلوک تم کو میرے ساتھ کرنا ہے وہ یہیں پورا کر دو۔ وہاں لے جا کر کیوں میری مٹی ذلیل کرتے ہو۔ میں تمہارے ارادے سے آگاہ ہوں۔ مولوی رجب علی خان بولے۔ آپ ایسا ہرگز خیال نہ فرماویں تشریف لے چلیں اور بیگم صاحبہ نواب زینت محل بھی تشریف لے چلیں۔ غرض اس وقت انکار پیش کیا چل سکتا تھا۔ ناچار تن بہ تقدیر بادشاہ نے فرمایا۔ بسم اللہ اور ہوادار میں سوار ہو کر ہمراہ ہوئے۔ زینت محل بھی پالکی میں سوار ہو گئیں۔ شاید چھوٹے صاحب زادے جواں بخت اور شاہ رخ بھی ہمراہ تھے۔ اس کی تحقیق نہیں ہوئی غرض کہ دلّی دروازے کے باہر پہنچے ہیں تو سانڈرس نے ہوادار کو ٹھہرایا اور وہ جو اجتماع ساتھ تھا روکا اور کہا۔ بابا لوگ ابھی تم لوگوں کا شہر میں داخل ہونا مناسب نہیں۔ فوج سرکاری تمام شہر میں پھیلی ہوئی ہے۔ مبادا کہ فساد ہو ابھی تم لوگ یہیں قیام کرو۔ ہم شہر کا انتظام کریں گے پھر بلوا لیا جائے گا اور چوراسی آدمی ضعیف العمر چھانٹ کر بادشاہ کی خدمت کے لیے مقرر کیے۔ اندر شہر

میں لے جا کر لال کنوئیں پر زینت محل والے مکان میں رکھا۔ باقی جو اور آدمی تھے ان سے کہا کہ ہتھیار ڈال دو ورنہ باغی تصور کیے جاؤ گے۔ اس پر سب نے ہتھیار ڈال دیئے۔ پھر منادی پھیر دی گئی کہ جس کے پاس ہتھیار ہوگا سرکار کا مجرم اور باغی سمجھا جائے گا۔ تمام رعیت نے ہتھیار ڈال دیئے جب بادشاہ کو شہر سے لے گئے ہیں اور رعیت سے ہتھیار طلب کر لیے ہیں۔ اس کے دوسرے روز سانڈرس جمعیت سواران کو ہمراہ لے کر نظام الدین میں پہنچے اور مرزا الٰہی بخش شاہزادے کی نشان دہی سے تیس شاہزادگان دہلی کو کہ ان میں بادشاہ کے بیٹے پوتے، نواسے اور داماد تھے گرفتار کر کے لائے اور بیرون دروازہ دہلی ان کو قتل کرا کے ان کے سر کٹوا کر بادشاہ کے پاس بھجوا دیئے۔

نہال گلشن اقبال پائمال ہوئے   گل ریاض خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا کمال ہوئے اور کیا زوال ہوئے   کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطر گل کو نہ ملتے ، ملے وہ مٹی میں
جو فرش گل پہ نہ چلتے ، ملے وہ مٹی میں
کہاں وہ خسرو عالی نظر بہادر شاہ   کہاں وہ سرور نیکو سیر بہادر شاہ
کہاں وہ بادشاہ دادگر بہادر شاہ   کہاں وہ داور والا گہر بہادر شاہ
کہاں سے باغی بے دین آگئے ہے ہے
کہ نام ان کا جہاں سے مٹا گئے ہے ہے
نہ دین دار تھا کوئی نہ دینداری تھی   ستم پرستی و جور و جفا شعاری تھی
نہ پاسداری ملت نہ مستعاری تھی   پر اس کے پیروں میں نمک حرام کاری تھی
غرض کہ دین کو سمجھے تھے وہ گنہگاری
نمک حرامی دشمن کشی تھی دینداری

دلی سے ہجرت

چار پانچ روز ہم کو برف خانے میں گزرے تھے کہ میر نواب کپتان بادشاہی کو پکڑوا کر پھانسی دلوا دی گئی جب یہ واقعہ نظر سے گزرا تو سب کو اپنی اپنی جانوں کا فکر ہوا۔ نواب حامد علی خان صاحب نے میری والدہ سے کہا کہ میں ان لڑکوں کا یہاں رہنا مناسب نہیں سمجھتا ہوں۔ ان کو رخصت کیجیے جہاں ان کو اپنے بچاؤ کی صورت نظر آئے چلے جائیں اور اپنی جانیں بچائیں۔ یہ لوگ کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہمارا اعتبار کیا ہے۔ ہم تو بوڑھے ہیں۔ ہم تم اہل و عیال کو سنبھالیں گے اور یہ روانہ ہو جائیں۔ چنانچہ میں ایک روز بسم اللہ کہہ کر خواجہ صاحب کی طرف روانہ ہوا۔ کوئی نصف میل کے قریب راہ طے کی ہوگی کہ ادھر سے سوار آئے۔ آتے ہی انہوں نے گھیر لیا اور کہا تلاشی دو اور سب کے سب کا بدن ٹٹول لیا۔ نہ میرے پاس کچھ پایا، نہ میرے ہمراہیوں کے پاس کچھ دیکھا۔ غرض خدا خدا کر کے وہ منزل قطع ہوئی اور قریب شام بسنت کی سرا میں پہنچے، تھکے ہارے۔ پانی پی کر سرائے میں پڑے رہے۔ اب آغاز و انجام اس سفر کا کچھ معلوم نہیں کہ یہ رستہ کہاں کو جاتا ہے۔ کون کون سے شہر راستہ میں پڑیں گے کس ریاست میں پہنچیں گے۔ بس ہمراہ قافلے کے ہیں، جدھر قافلہ جاتا ہے اسی کو منزل مقصود سمجھا جاتا ہے، گھر سے کبھی نکلے نہیں۔ اس مصیبت کا سفر کیا نہیں۔ راستہ سے نابلد، منزلوں سے ناواقف، شہروں اور ریاستوں کا حال سوائے عملداری انگریزی کچھ نہیں جانتے۔ ایک دو بار پہلے سفر کا اتفاق ہوا ہے تو آگرہ میرٹھ وغیرہ کی طرف ہوا ہے۔ تو بہ کمال آسائش، سواریوں پر آدمی خدمت میں بڑی دل لگی کا سفر ہوا ہے۔ نہ اس مصیبت کا کہ زمین تک قدم دھرنے کی روادار نہیں۔ جہاں جھاڑ۔ کانٹا کانٹا دشمن جان ہے گرمی اور جے پور۔ بیکانیر کا نام تو سنا ہے مگر اتفاق سفر ہوا نہیں نہ یہ معلوم کہ کتنی دور ہے۔ غرض مختصر شب کو پڑے رہے۔ صبح ہوتے ہی پھر قافلے کے ہمراہ ہو لیے۔ دوپہر کو جا کر فرخ نگر میں داخل ہوئے۔ کچھ چاندی بیچ کر کھانے کی تجویز کی۔ اب جو دوراہا ہے۔ وہاں سے سب طرف کو راستہ جاتا ہے۔ وہاں باہم مشورے ہونے لگے کسی نے کہا ہم ادھر جائیں گے، کسی نے کہا ہم ادھر جائیں گے۔ ہم حیران کہ یا الٰہی ہم کدھر جائیں۔ مگر ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں سے جھجر قریب ہے۔ یہ نام سنتے ہی جان میں جان آئی۔ وہاں تو ہمارے ماموں حکیم مرزا قاسم علی خان صاحب ممتاز ریاست ہیں ان کے پاس چلیے اور ان کی صلاح کے کاربند رہیے۔"

جنگ آزادی اور چشم حقیقت بیں

اب تک آپ نے جنگ آزادی کی ایک ایسی منظر کشی دیکھی جس میں ایک بادشاہ کے حامی نے رنگ آمیزی کی تھی۔ جس کی نگاہ میں یہ جنگ آزادی نہیں تھی بلکہ ایک بغاوت تھی انگریزوں اور کسی حد تک شاہ ظفر کے خلاف۔ سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی بادشاہ کے ملازم تھے۔ انہوں نے جنگ آزادی کے ہر پہلو کو ایک شاہ پرست کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے حالات چشم دیدہ ہیں اور اپنے گھر کے واقعات کی انہوں نے منظر کشی بڑے المناک انداز میں کی ہے اور اس پر آشوب دور کی حقیقی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اب آپ کی خدمت میں جنگ آزادی کی جو تصویر پیش کی جا رہی ہے اس کی رنگ آمیزی حقیقت نگار قلم سے ہوئی ہے۔ واقعات اور اسباب کو پورے سیاق و سباق اور مکمل سیاسی پس منظر کے ساتھ پرکھا گیا ہے اور بلاشبہ یہی واقعات اور اسباب تھے جو جنگ آزادی کے محرک ہوئے اور جس نے ہمارے اردو ادب اور ہماری تاریخ پر اپنے گہرے اور انمٹ نقوش مرتسم کیے۔

دہلی میں افواہیں

دہلی میں کچھ تو ایران و روس کے متوقع حملے کی بنا پر اور کچھ نعمت اللہ شاہ ولی کی پیشگوئیوں کے باعث پہلے سے ایک غیر معمولی بے چینی پائی جاتی تھی۔ کلکتہ کے آس پاس جو واقعات پیش آ چکے تھے ان کی خبریں بھی مل گئی تھیں۔ چونکہ دماغوں میں ایک خاص قسم کا تصور قائم ہو چکا تھا، اس لیے تمام خبروں کو اس تصور کے آئینے میں دیکھا جاتا تھا۔ میرٹھ کے پچاسی سپاہیوں کے لیے جو فوجی عدالت قائم کی گئی تھی اس میں دہلی سے کچھ فوجی افسر شامل ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی واپس جا کر اپنے تاثرات مختلف آدمیوں کو سنائے ہوں گے۔ اور ان باتوں کی بھنک باہر پہنچ جانا بالکل اغلب تھا۔ سب سے آخر میں یہ کہ میرٹھ کی سپاہ نے ۹ مئی کو سرکشی کا آخری فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے لیے دس مئی کی شام کا وقت مقرر ہو چکا تھا۔ یہ خبر بھی دہلی کی چھاؤنی میں پہنچ دی گئی تھی۔ گویا سارا شہر نہیں تو کم از کم اس کے مختلف افراد کسی نہ کسی ہنگامے کے آغاز کی امید میں لگے بیٹھے تھے اگرچہ انہیں ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہوگا کہ ہنگامہ کب شروع ہوگا۔ کس شکل میں شروع ہوگا۔ اور اس کے شعلے کیونکر بھڑکیں گے۔

سائمن فریزر کو اطلاع

یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اگرچہ میرٹھ کی انگریزی فوج نے بعض خاص مصلحتوں کی بنا پر سرکشوں کا تعاقب نہ کیا۔ لیکن تار کے ذریعے سے سائمن فریزر کو دہلی اطلاع بھیج دی تھی۔ تاکہ وہ سرکشوں کے پہنچنے سے قبل مناسب احتیاطی تدابیر اختیار کر لے۔

یہ تار اس وقت ملا۔ جب فریزر سو گیا تھا۔ نوکر نے جگا کر تار دے دیا فریزر نے جیب میں ڈال کر پھر سو گیا، اور صبح اس وقت تار دیکھا۔ جب میرٹھ کے سپاہی دہلی پہنچ چکے تھے۔ ایک بیان یہ ہے کہ بہت روپیہ خرچ کر کے ایک چٹھی دہلی بھیجی گئی تھی۔ جو رات کے دس گیارہ بجے ملی تھی۔ لیکن فریزر چونکہ سو رہا تھا۔ لہٰذا صبح تک اس نے چٹھی نہ دیکھی

اور دفاعی انتظامات کا وقت ہاتھ سے نکل گیا۔

چونکہ فریزر سپاہیوں کے شہر میں داخل ہوتے ہی مارا گیا تھا۔ اس لیے تار یا جھی کی تحقیقات بھی نہ ہو سکی اور تحقیقات ہو بھی جاتی۔۔۔ تو اس سے نتیجہ کیا نکل سکتا تھا؟

سپاہیوں کی آمد

بہر حال سپاہی بہت سویرے دریائے جمنا پر پہنچ گئے تھے غازی آباد کی طرف کے کنارے کے پاس پرمٹ کی ایک چوکی تھی۔ اُسے آگ لگائی، پرمٹ والے افسر کو مارا، پھر کشتیوں کے پل پر پہنچے۔ وہاں تار کے محکمے کا ایک انگریز کارکن تھا جس کا نام ٹاڈ تھا۔ وہ تار کی درستی کے لیے جا رہا تھا۔ اسے قتل کیا اور کلکتہ دروازے پر پہنچ گئے۔ اسے بند دیکھا تو شاہی جھروکے کے نیچے کھڑے ہو کر شور مچایا کہ ہم نے میرٹھ میں انگریزوں کو قتل کر دیا ہے۔ دین کی خاطر جنگ کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہماری امداد فرمائیے اور سر پر ہاتھ رکھیے، حضور ہی ہماری دنیا اور دین کے نگہبان ہیں۔

بادشاہ تک یہ باتیں پہنچیں تو کپتان ڈگلس کو بلایا جو قلعے کی گارد کا افسر تھا۔ اس نے کیفیت سن کر کہا کہ میں سپاہی کو سمجھاتا ہوں۔ بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں دونوں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور کہا کہ ہم نہ جانے دیں گے۔ ڈر یہ تھا کہ شاید سپاہی گولی چلا دیں۔ چنانچہ ڈگلس نے برآمدے میں آکر سپاہیوں سے کہا کہ یہ بادشاہ کی خواب گاہ ہے تم شور و غل سے حضور کو تکلیف نہ دو یہ فریاد سننے کی جگہ نہیں، تم کوٹلہ کی طرف جاؤ۔۔۔ وہاں جو کچھ کہنا ہو کہو ضرور تمہاری شنوائی ہوگی۔

راج گھاٹ دروازہ

چنانچہ سپاہی وہاں سے راج گھاٹ دروازے کی طرف چلے گئے۔ کلکتہ دروازے کی طرح راج گھاٹ دروازہ بھی بند تھا۔ کچھ معلوم نہیں کہ اسے کس نے کھول دیا تو پہریداروں میں سے کوئی ان کے ساتھ مل گیا، یا ممکن ہے۔ دروازہ اس لیے کھول دیا گیا ہو۔ کہ ہندو اسی دروازے سے اشنان کرنے کے لیے دریا پر جایا کرتے تھے۔

سید ظہیر دہلوی کا بیان ہے کہ دریا میں اشنان کرنے والے ہنود کے قریب جمع ہو گئے تھے اور دروازہ کھولنے کے لیے اصرار کر رہے تھے۔ آخر نوبت زد و کوب کی پہنچی اور لوگوں نے بلوہ کر کے پتھروں سے قفل توڑ دیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ دروازہ پہلے سے کھلا تھا۔

بس۔ راج گھاٹ دروازے سے داخل ہوتے ہی انگریزوں کا قتل شروع ہو گیا۔ اور اس پر کتنا ہی افسوس کیا جائے۔ لیکن تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ لوگ میرٹھ میں جو کچھ کر آئے تھے۔ اس کے بعد انہیں معافی کی کیا اُمید ہو سکتی تھی؟ وہ آخری داؤ لگا چکے تھے۔ اور جو قدم انہوں نے اٹھا لیا تھا اسے واپس لینے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اب ان کے لیے بچاؤ کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ حالات کو زیادہ سے زیادہ بگاڑ دیں اور ایسی صورت پیدا کر دیں کہ ہر جگہ آگ بھڑک اٹھے۔ انگریزوں کا قتل ان کے نزدیک اس لیے ضروری تھا کہ اگر زندہ رہے تو تادیبی کاروائیاں شروع ہو جائیں گی۔ اس حالت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام بھی تذبذب میں پڑ جائیں گے۔

اگر انگریزی حکومت کا نشان تک مٹ جاتا تو عوام کے لیے دو دلے رہنے کا بظاہر بہت کم امکان تھا البتہ یہ ضرور کہہ دینا چاہیے کہ عورتوں اور بچوں یا ان لوگوں کے قتل کی کوئی وجہ نہ تھی جو جنگ کے قابل نہ تھے یا جن کے ذریعے سے کسی تادیبی کاروائی کا امکان نہ تھا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ عام ہنگامہ بپا ہوتا ہے تو اکثر آدمی حق و ناحق کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں اور ان پر ایک خاص قسم کی جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ سرکشوں پر بھی ایک جنونی کیفیت طاری تھی، یہ جو کچھ عرض کیا گیا اسے ایک غلط فعل کی معذرت نہیں سمجھنا چاہیے۔ مقصود یہ ہے، کہ حالات کا نقشہ زیادہ سے زیادہ صحیح صورت میں سامنے آجائے۔

ہمہ گیر افراتفری

کپتان ڈگلس سوچ رہا تھا کہ کیا کیا جائے اس اثنا میں اسے سائمن فریزر کمشنر کا پیغام ملا کہ جلد سے جلد کلکتہ دروازہ پر پہنچو۔ وہ گیا۔ تو وہاں سائمن فریزر ہچن سن (کلکٹر) اور تھیوفلس مٹکاف (مجسٹریٹ) موجود تھے۔ سپاہ پل سے گزر کر دروازے پر آپہنچی تھی۔ اندر کی طرف بھی تماشائیوں کا اجتماع ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فریزر نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مٹکاف نے یہ مناسب سمجھا کہ جلد سے جلد کوتوالی پہنچ کر پولیس گارد کو دروازوں کی حفاظت کے لیے بھیج دے۔ اس اثنا میں ایک گولی سائمن فریزر کے پاس سے گزری۔ اس نے ایک سپاہی کی بندوق لے لی اور گولی چلانے والے کو ختم کر دیا۔ بس اس کے ساتھ ہی اس زور سے حملہ شروع ہوا کہ انگریز افسر پیچھے کی طرف بھاگے۔

میرا خیال ہے کہ اس اثنا میں راج گھاٹ دروازے سے داخل ہونے والے سپاہی آپہنچے تھے اور انہوں نے پیچھے سے حملہ کر دیا تھا۔ انگریزوں نے بھاگ کر قلعے میں پناہ لی۔ ڈگلس خندق میں کودا اس کا پاؤں زخمی ہو گیا اور چپراسی اسے نیم بیہوشی کی حالت میں اٹھا کر اندر مکان میں لے گئے۔ ڈگلس کے پاس ایک پادری بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ ساتھ اس کی بیٹی اور ایک اور انگریز لڑکی بھی تھی۔ فریزر اور ہچن سن بھی وہیں پہنچ گئے۔ اب جو آدمیوں کا ریلا آیا تو اس میں یہ سب لوگ بڑی ہی بے دردی سے قتل کر دیے گئے۔ باقی انگریزوں کو بھی حتی الامکان چھوڑا نہ گیا۔

زیادہ تر انگریز اور عیسائی دریا گنج میں رہتے تھے جو راج گھاٹ کے دروازے سے قریب تھا اور جہاں سپاہی پہلے پہنچے تھے۔ ان میں سے اکثر ختم کر دیے گئے سب سے پہلے ایک ہندوستانی ڈاکٹر چمن لال مارا گیا یہ دریا گنج میں ہی تھا۔

مٹکاف کی داستان

بڑے انگریز افسروں میں سے صرف تھیوفلس مٹکاف بچ نکلا۔ اس کی سرسری کیفیت یہ ہے کہ پہلے پولیس کے پہرہ داروں میں سے چند کو دروازوں کی حفاظت کے لیے بھیجا، پھر وہ کلکتہ دروازہ کی طرف آیا تو ہجوم کو دیکھ کر گاڑی بھگائی۔ کوتوال کو کوتوالی کی حفاظت کے لیے ہدایت کی اور خود دریا گنج کی طرف گیا۔ راستے میں تین سوار ملے۔ ان سب نے پستول چلانے چاہے۔ مٹکاف تازیانے مار مار کر انہیں پیچھے ہٹاتا رہا۔ پھر گاڑی سے کود کر اُترا۔ کوٹ اتارا، پتلون اتاری اور گلیوں کے اندر بھاگا۔ اتفاق سے جھجر کا ایک سوار محمد خان نظر آیا اس سے گھوڑا مانگا، محمد خان نے انکار کیا، تو مٹکاف نے اُسے ٹانگ سے پکڑ کر نیچے گرا دیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر جاوڑی میں سے ہوتا ہوا اجمیری دروازے کی طرف گیا۔ اجمیری دروازے کے دکاندار لاٹھیاں لے کر اسے مارنے نکلے۔ لیکن وہ بہ خیر عافیت پہاڑ گنج پہنچ گیا۔ بعد ازاں چند روز ایک میواتی کے ہاں چھپا رہا پھر جھجر گیا۔ وہاں سے بڑی پریشانی کی حالت میں نکلا اور چھپتا چھپاتا سکنز کے مقام پر بمقام ہانسی چلا گیا۔ تفصیلات یہاں غیر ضروری ہیں۔

بنک

دوپہر سے پہلے پہلے تک بہت سے بڑے بڑے انگریز افسر مارے جا چکے تھے۔ اب لوگوں کی توجہ بنک کی طرف ہوئی۔ حملے کے آغاز ہی میں کشت و خون کا ہنگامہ عام شروع ہو گیا تھا۔ بیرس فورڈ منیجر نے یہ حالت دیکھی تو اپنی بیوی بچوں کو ساتھ لے کر بنک کی چھت پر چڑھ گیا اور کچھ دیر مزاحمت جاری رکھی۔ آخر عمارت کو آگ لگا دی گئی اور اس کے شہتیر جل جل کر گرنے لگے۔ منیجر اور اس کے کنبے کے افراد بھی مارے گئے۔ مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں کہ بنک کے روپے

لٹنے کی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ بعض مقطع الدقعہ آدمی اندر گھسے اور توڑے بغلوں میں لے کر نکلنے لگے۔ سب توڑے یا تو سپاہیوں نے چھین لیے یا بدمعاشوں نے دکھوا لیے۔ بدمعاشوں کے توڑے بھی آخر کار سپاہیوں کے ہی قبضے میں آ گئے۔ دفتر کے کھاتے بھی لٹ گئے۔ لیکن بعد فتح دہلی جب بنک نے رجسٹروں کے بہم پہنچانے کا اشتہار دیا تو تمام رجسٹر مل گئے۔

دہلی گزٹ پریس

غرض ایک مخصوص انگریزی ادارہ ہدف یورش بننے لگا۔ بنک کے بعد دہلی گزٹ پریس کی باری آئی۔ وہاں عیسائی کمپوزیٹر کام میں مصروف تھے۔ وہ صبح اخبار کی ایک غیر معمولی اشاعت میں یہ خبر چھاپ چکے تھے کہ میرٹھ سے سپاہ سرکشی کر کے دہلی پہنچ رہی ہے۔ دوپہر کے وقت آدمیوں کا ایک گروہ پریس کی عمارت میں جا گھسا۔ کمپوزیٹر مارے گئے، سامان تباہ کر دیا گیا۔ چھاپ کے لیے جو سیسہ تھا اسے اٹھا کر لے گئے کہ گولیاں بنا کر گوروں کو ماریں گے۔ گرجا بھی دستبرد سے نہ بچ سکا، اس کے اوپر جو صلیب لگی ہوئی تھی گولیوں سے چھلنی کر دی گئی۔ دیواروں پر جا بجا یادگاری سلیں نصب تھیں ان سب کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ گھنٹے کی رسیاں کاٹ دیں اور وہ پتھروں پر گرا تو بڑا دھماکہ ہوا۔

چھاؤنی

چھاؤنی کا علاقہ، کشمیری دروازہ، موری دروازہ، تیلی واڑہ اور کشن گنج کے پاس سے شروع ہو کر پہاڑی کے ساتھ ساتھ دور تک جاتا تھا۔ اس جگہ اب یونیورسٹی بن گئی ہے۔ خاص چھاؤنی پہاڑی کے اوپر تھی اور شہر سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ہوگی۔ انگریز افسروں کی کوٹھیاں زیادہ تر ایک جگہ تھیں۔ سرکش افواج کے داخلے کی خبر سن کر وہاں سے کچھ دستے شہر کے اندر بھیجے گئے۔ لیکن جب انہیں سرکشوں پر آتش باری کا حکم دیا گیا تو دیسیوں میں سے کسی نے بھی اس حکم کی تعمیل نہ کی۔ اس طرح ان کی بھی سرکشی آشکارا ہو گئی، اس میں بھی متعدد انگریز افسر مارے گئے۔ لیکن بعض انگریز افسروں کو سپاہیوں نے محفوظ واپس پہنچا دیا اور کہا کہ اب آپ اپنی حفاظت کا خود بندوبست کر لیں ہم بے بس ہیں۔

میگزین

سب سے آخر میں میگزین کی باری آئی جس میں ہر قسم کا سامانِ جنگ بہ افراط موجود تھا۔ اس کا افسرِ اعلیٰ لیفٹیننٹ ولوبی تھا اور لیفٹیننٹ فارسٹ اس کے معاونوں میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ شروع میں کوشش کی گئی تھی۔ میگزین سے دو توپیں لے کر ایسی جگہ نصب کر دی جائیں کہ سرکش فوج جمنا کے پل پر سے گزر کر شہر کے دروازے پر نہ آ سکے۔ لیکن جب توپیں نکالی گئیں تو معلوم ہوا کہ سپاہ پل سے گزر کر دروازے پر آ چکی ہے۔ نیز ایک دستہ راج گھاٹ دروازے سے اندر داخل ہو چکا ہے۔ اس وقت توپیں نکالنا بالکل بے سود تھا۔ جب شہر کو بچانے کی تمام امیدیں زائل ہو گئیں تو میگزین کے دفاع کا پختہ انتظام کر لیا گیا۔ ولوبی کے پاس صرف آٹھ فرنگی تھے۔ نواں وہ خود تھا۔ کاروان سپاہی سب کے سب اس فوج سے تعلق رکھتے تھے جو سرکشی اختیار کر چکی تھی اور جن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جتنے دیسی کاریگر میگزین میں کام کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی بندوق چلانا نہیں جانتا تھا۔

غرض میگزین کا دروازہ بند کر کے اندر کی طرف مٹی کے بورے بھر کر رکھ دیے گئے تاکہ دروازہ آسانی سے نہ کھولا جا سکے۔ نیز سپاہی بوروں کے پیچھے بیٹھ کر گولیاں چلا سکیں۔ دو توپیں بھی نصب کر دی گئیں۔ یوں حفاظت کے پورے انتظامات کر کے مقابلے کی تیاری کر لی گئی۔ جب اطلاع ملی کہ سیڑھیاں آ رہی ہیں جن کے ذریعے حملہ آور اندر آ جائیں گے تو بارود کے ذخیرے سے باہر دور تک بارود بچھا دی گئی تاکہ دور ہی سے آگ دے کر بارود اور سازوسامان کو اڑایا جا سکے اور ذخیرہ سرکشوں کے قبضے میں نہ جانے پائے۔

جب میگزین کے بچاؤ کی کوئی صورت نہ باقی رہی تو آگ لگا دی گئی۔ انگریزوں میں سے صرف پانچ زندہ بچے۔ بہت سے حملہ آور بھی مارے گئے۔ اگرچہ میگزین کے اڑنے سے سامان کو اتنا نقصان نہ پہنچا جتنا کہ پہنچانا منظور تھا تاہم ان انگریزوں کے کارنامے کو ۱۸۵۷ء کے چند بہت بڑے کارناموں میں شمار کیا گیا۔

متفرق واقعات

میگزین کے قریب لوہاروں کا کارخانہ تھا۔ جسے "لوہار خانہ" کہتے تھے۔ اس میں ہلکے اوزار بنتے تھے۔ یہ بھی لوٹا گیا لالہ ٹھاکر داس قید خانے کا داروغہ تھا۔ صبح ہی سے اس کے جیل میں تشویش پھیلی ہوئی تھی۔ پانچ بجے شام تک اس نے معاملات کو بگڑنے نہ دیا۔ پھر جب واضح ہو گیا کہ سپاہی نہیں رکیں گے، تو لالہ ٹھاکر داس جیل خانہ چھوڑ کر چلا گیا۔ یہاں معاملہ قیدیوں کی رہائی تک محدود رہا۔ خزانہ محفوظ کا محفوظ بادشاہ کے پاس پہنچا دیا گیا۔

چھاؤنی میں جتنے انگریز محفوظ رہ گئے تھے۔ انہوں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ نکل جائیں، سواریاں ان کے قبضے میں تھیں۔ ان میں بال بچوں کو بھی بٹھایا اور خود بھی بیٹھے بعض نے کچھ اسباب بھی رکھ لیا۔ اور نکل پڑے۔ کچھ کرنال اور انبالہ کی طرف چل پڑے کچھ میرٹھ پہنچ گئے۔ بعض راستے میں مارے گئے۔ جو انگریز قید ہوئے تھے ان میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔ انہیں پہلے حرم شاہی کے ایک حصے میں رکھا گیا اور چند روز بعد سرکشوں میں انتقاماً انہیں قتل کر ڈالا۔

چند ضروری سوالات

یہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کے واقعات کی سرسری سرگزشت ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض ضروری سوالات پر غور کر لیں مثلاً:

۱. کیا یہ سب کچھ شاہ دہلی یا اس کے خاص مشیروں کے ساتھ سازباز کی بنا پر ہوا تھا؟
۲. کیا شاہ دہلی کو انگریز افسروں یا دوسرے افراد کے قتل کے لیے کسی بھی درجے میں ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے؟
۳. کیا شاہ دہلی اس ہنگامے یا سرکشی کو واقعی اپنے مستقبل کے لیے مفید سمجھتا تھا۔ اور کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے چار مہینے میں جو کچھ کیا۔ وہ آزادیٔ وطن کے لیے تھا؟

ان سوالوں کا جواب زیادہ تفصیل کا طلب گار نہیں۔ بادشاہ یا اس کے مشیروں کو اس ہنگامے کے آغاز یا اس کے بارے میں سازباز سے قطعاً کوئی علاقہ نہ تھا۔ بلکہ جب تک میرٹھ کی سپاہ دہلی نہ پہنچ گئی، کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ باہر کوئی ہنگامہ بپا ہو چکا ہے۔ اس وقت تک اکثر لوگوں کو یقین ہوگا کہ انگریز جلد سے جلد تعاقب میں پہنچیں گے۔ اس لیے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ لوگ سرکش سپاہ کے خیر مقدم کے لیے بھی دل سے تیار نہ ہوں گے۔ تاہم جب تک معاملات کی باگ ڈور سپاہ کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے لیے عافیت کی راہ یہی تھی کہ اپنی دلی بے اطمینانی یا نارضامندی کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے۔

انگریزوں کا قتل

اس حقیقت میں شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں کہ بادشاہ کو انگریزوں کے قتل سے ہرگز کوئی تعلق نہ تھا۔ بیشک وہ انگریزوں کو اچھا نہیں سمجھتا تھا لیکن کسی کو برا سمجھنا ایک اور بات ہے اور اسے قتل کرا دینا، یا اس کے قتل پر خوش ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ سپاہیوں میں بعض بہت تیز مزاج تھے اور ان کا خیال تھا کہ جب تک ایک ایک انگریز کو موت کے گھاٹ نہ اتار دیا جائے گا — ہندوستان کی آزادی کا مطلع صاف نہ ہوگا۔ یہ خیال صحیح نہ تھا لیکن ہنگامے

عوامی تحریکوں میں اس قسم کی بے اعتدالیاں اکثر پیش آتی ہیں۔ انقلاب فرانس کی حالت دیکھیے وہاں معاملہ اجنبیوں کا نہ تھا بلکہ ہموطنوں کا تھا۔ پہلے ان امیروں کو بے امتیاز مارا گیا۔ جن سے عوام تنگ تھے۔ پھر خود عوامی لیڈروں کے مختلف گروہ ایک دوسرے کے ہاتھ سے ذبح ہوتے رہے۔ طبیعتوں پر شکوک غالب تھے اور جذبات مشتعل۔ ہر چھوٹی بڑی مخالف خبر سن کر پریشانی بڑھ جاتی تھی۔ پھر بعض اوقات اپنے کسی عزیز یا دوست یا ہم وطن و ہم شہر کی موت کا انتقام کشی کا ایک عجیب و غریب جنون پیدا کر دیتی تھی۔ یقیناً یہ افعال نازیبا تھے۔ لیکن بہادر شاہ کسی بھی درجے میں ان کے لیے ذمہ دار نہ تھا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی جان دے دینے میں کیوں تامل کیا؟ لیکن زیر غور معاملہ اخلاقی یا قانونی ذمہ داری کا ہے۔ نہ کہ درجات ایثار کے تعین کا؟

بہادر شاہ اور جہاد آزادی

بہادر شاہ نے چار مہینے کی حکومت میں جو کچھ کیا۔ اس کے بارے میں گفتگو آگے چل کر ہوگی۔ یہاں صرف یہ بتا دینا چاہیے کہ جو موقع ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس میں مختلف رنگوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انگریزوں کی طرف سے تعاقب میں دیر ہوئی۔ دہلی میں باکثرت فوج جمع ہو گئی، اور جا بجا ہنگامے ظہور پذیر ہو چکے تو بہادر شاہ کو امید پیدا ہو گئی ہوگی کہ انگریزوں کی بساط حکومت لپٹ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک قومی آزادی کے وہ تصورات دماغوں میں موجود ہی نہ تھے۔ جو اب رواج عام پا چکے ہیں اور آزادی کا تصور ملکی حکمران ہی کی شکل میں کیا جاتا تھا۔ بہادر شاہ نے سمجھنا شروع کر دیا ہوگا کہ اس کی حکومت بحال ہو جائے گی — اور انگریز ہمیشہ کے لیے نکال دیے گئے۔ بعض ایسی مستند اطلاعات بھی ہمارے سامنے موجود ہیں کہ بہادر شاہ اس سارے ہنگامے کو اپنی بربادی کا سامان قرار دیتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ یہ در اصل وقتی تاثرات تھے۔ جب حالات سازگار ہو جاتے تھے تو سمجھا جاتا تھا کہ انقلاب کامیاب ہو رہا ہے۔ جب باہر سے شکست کی خبریں آتیں اور خود عساکر دہلی کی بد نظمی پر نظر پڑتی تو دل پر یہ اثر ہوتا کہ یہ چند روزہ کھیل ہے۔ بہادر شاہ تو خیر بوڑھا تھا اور اس سے سرگرم جد و جہد کی توقع ہی نہ ہو سکتی تھی۔ شہزادوں میں سے بھی کوئی صاحب ہمت پیدا نہ ہوا۔ ایک فیروز شاہ مستثنیٰ شخصیت کا مالک تھا۔ لیکن وہ دہلی میں نہیں تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ دہلی میں ہوتا، تو دوسرے شہزادوں کی رقابتوں سے اس کی سرگرمیوں پر کیا اثر پڑتا۔

بیانات کا دوسرا مرقع

اوپر ہم نے واقعات کے متعلق جو کچھ لکھا وہ اردو اور انگریزی کی مستند کتابوں کے بیانات کا خلاصہ ہے۔ سید ظہیر دہلوی نے بعض ایسی تفصیلات بتائی ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں۔ ان کا خلاصہ ذیل میں درج ہے:-

۱۔ بہادر شاہ جھروکے میں بیٹھا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ نیچے سواری کی تیاری تھی۔ یکایک جھروکے پر سے ہنکارے کی آواز آئی۔ میر فتح علی ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔ اشارۂ سابہ سے دریا کے پل کی جانب ایما ہوا۔ دیکھا تو دریا پار میر بحر کے بنگلے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میر فتح علی نے رسالدار کو حکم دیا کہ سوار بھیج کر خبر منگواؤ۔

۲۔ سواروں نے کوئی پانچ منٹ میں واپس آ کر خبر دی کہ غنیم دلی پر چڑھ آیا ہے۔ اس کی فوج نے تاخت و تاراج پر کمر باندھی ہے۔ بنگلہ پھونک دیا۔ میر بحر کو مار ڈالا— مال کا صندوق لوٹ لیا۔

۳۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ پل توڑ دیا جائے۔ کشتیاں کھینچ لی جائیں۔ شاہی فوج مورچے پر چلی جائے۔ کوتوال تمام دروازے بند کرا دے۔ اس اثنا میں سوار سلیم گڑھ کے نیچے سے ہوتے ہوئے جھروکے کے نیچے پہنچے۔ جو لوگ مختلف دروازوں سے باہر نکلے تھے وہ سب گرتے پڑتے اندر چلے گئے اور دروازے بند کر دیے۔

۴۔ سواروں نے اپنی شکایات تفصیل سے پیش کیں۔ وہ تمام حالات بتائے جو سرکشی کا موجب بنے تھے۔ بادشاہ نے اپنی بے بسی اور بے مائیگی پیش کی اور کہا نہ میرے پاس خزانہ ہے نہ نوکر رکھ سکتا ہوں۔ البتہ بیچ میں پڑ کر انگریزوں سے صفائی کرا دیتا ہوں۔

۵۔ سائمن فریزر نے جھروکے پر سے سپاہیوں کے ساتھ لمبی گفتگو کی۔ اس اثنا میں ایک سپاہی نے فریزر پر بندوق چلا دی۔ گولی حکیم احسن اللہ خان کے برابر میں سے نکل کر تسبیح خانے کے ستون پر جا لگی اور سنگ مرمر کا ٹکڑا اڑ کر گر پڑا۔

۶۔ بادشاہ نے اپنے آدمی ساتھ کرنے چاہے۔ فریزر نے کہا کہ دربار کی سوبھا کے آدمی ہیں۔ ڈیوڑھی کی حفاظت کو رہنے دیجیے۔ حضور کا اقبال کافی ہے۔ حضور خاطر جمع رکھیں۔

۷۔ سائمن فریزر اور ڈگلس باہر گئے۔ سواروں نے بگھی کو آ گھیرا۔ صاحب نے بگھی کے گھوڑے کی باگ قلعے کے دروازے کی طرف پھیری۔ ایک سوار کو پستول سے قتل کیا اور کھڑکی کے راستے دونوں اندر پہنچ گئے۔ پیچھے سے ہوتے ہوئے یہ زینے پر چڑھ رہے تھے ڈگلس ہلکا پھلکا تھا۔ پہلے چڑھ گیا۔ فریزر جسیم تھا لہٰذا پیچھے رہا۔ سرکشوں نے ان کا کام تمام کر دیا۔

ہنگامے کی خبریں

دہلی سے ہنگامے کے متعلق جو پہلا تار بھیجا گیا اُس کا متن یہ تھا—

"ہمیں دفتر سے چلے جانا چاہیے۔ تمام بنگلے جل رہے ہیں۔ میرٹھ کے سپاہیوں نے انہیں آگ لگائی ہے۔ وہ آج صبح آئے تھے، ہم جا رہے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ سی ٹاڈ مارا جا چکا ہے۔ وہ صبح گیا تھا۔ اب تک واپس نہیں آیا۔ معلوم ہوا ہے کہ اب تک نو فرنگی مارے جا چکے ہیں۔ یہ تین بجے کا تار تھا۔ چار بجے یہ تار گیا— چھاؤنی محصور ہے۔ میرٹھ کے باغی نمبر ۳ لائٹ رسالہ۔ تعداد معلوم نہیں کہا جاتا ہے کل ڈیڑھ سو آدمی۔ میرٹھ سے سلسلہ مخابرت کاٹ دیا گیا۔ کشتیوں کے پل پر قبضہ کر لیا گیا۔ ۵۴ دیسی پیادہ ان کے مقابلے پر بھیجی گئی تھی۔ لیکن وہ کچھ کرنے کے لیے تیار نہ ہوئی بہت سے افسر مقتول و مجروح ہوئے شہر میں افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ فوجیں بھیجی گئیں لیکن کچھ معلوم نہیں کیا ہوا۔ اطلاع ملے گی تو پہنچا دی جائے گی"

جنرل این سن

جنرل این سن (ANSON) سپہ سالار اعظم اس وقت شملہ میں تھا۔ بیشتر انگریزی دستے بھی پہاڑوں ہی پر پہنچے ہوئے تھے۔ ۱۲ مئی کو اُسے میرٹھ کے ہنگامے کی خبر ملی۔ اگرچہ اس خبر سے حالات کی نزاکت کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا تاہم اس نے کسولی، ڈگشائی اور سباتھو کی پلٹنوں کو تیار رہنے کا حکم بھیج دیا۔ مزید دو روز میں بہت سی تفصیلات مل گئیں جن سے ہنگامے کی وسعت و شدت کا اندازہ ہو گیا۔

چنانچہ فیروز پور، امرت سر، جالندھر اور پھلور کے میگزینوں کو حفاظت میں لے لینے کے احکام جاری کر دیے گئے۔

۱۴ مئی کو جنرل این سن شملہ سے چلا اور ۱۵ مئی کو صبح اسی میل کا فاصلہ طے کر کے انبالہ پہنچ گیا۔

اسی اثنا میں جتوک کی گورکھا پلٹن کو حکم بھیج دیا گیا کہ فی الفور پھلور چلی جائے۔

اور وہاں سے توپ خانہ لے کر انبالہ پہنچے۔ فیروز پور اور کانگڑہ کی فوجوں کو بھی یہی حکم بھیجا گیا۔ رڑکی اور ڈیرہ کی سفر مینا اور گورکھا پلٹن کو میرٹھ پہنچنے کی ہدایت ہوئی۔ مختلف فوجیں انبالہ پہنچیں۔ تو اینسن نے کچھ سامانِ جنگ اور حمل و نقل کا بندوبست کر کے ایک دستے کو کرنال کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ دہلی کی جانب پیش قدمی کا مقدمہ تھا۔

تذبذب

یہ اطلاع مل ہی چکی تھی کہ دہلی میں معتدبہ فوج جمع ہو گئی ہے۔ اس لیے اینسن سمجھتا تھا کہ جب تک انگریزی فوج خاصی تعداد میں جمع نہ ہو جائے گی۔ دہلی پر حملہ مناسب نہ ہوگا۔ توپوں کی گولہ باری سے فصیل کو توڑ لینا مشکل نہ تھا۔ لیکن شہر کی پُر پیچ گلیوں میں تھوڑی فوج کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پنجاب میں اس وقت سر جان لارنس حاکم تھا، اس کی رائے تھی کہ دہلی پر فوراً حملہ کیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ انگریزی فوج کو دیکھتے ہی شہر کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔

انگریزی اقتدار کی تاریخ میں یہ بڑا ہی نازک موقع تھا۔ بلاشبہ اینسن یا کوئی بھی سپہ سالار تھوڑی سی فوج لے کر دہلی پر یورش نہیں کر سکتا تھا، اور کرتا تو اس فوج کے تباہ ہو جانے کا خطرہ بہت زیادہ تھا۔ اس موقع پر اُسے جیند اور پٹیالہ کے سکھ راجاؤں کی امداد نے بڑی تقویت پہنچائی۔ اس کی وجہ سے کمک بھی مل گئی۔ انبالہ اور پانی پت کے درمیان وسائل حمل و نقل بھی محفوظ ہو گئے اور اینسن کو انبالہ کی حفاظت کے انتظامات مکمل کر کے آگے بڑھنے کا موقع بھی مل گیا۔

سکھوں کی پوزیشن

جیند، نابھ اور پٹیالہ کی ریاستیں ایسی جگہ واقع تھیں کہ اگر وہاں کے رئیس ذرہ صبر کرتے تو دہلی سے ستلج تک کا علاقہ انگریزوں کے لیے غیر محفوظ ہو جاتا۔۔۔ اور انبالہ بھی خطرے میں پڑ جاتا۔ اگر وہ قومی آزادی کی جنگ میں معاون بن جاتے۔ تو انگریزوں کے چھوٹے چھوٹے دستے بکھرے رہتے۔ اور ان کے لیے اکٹھے ہونے یا آپس میں سلسلہ مخابرت قائم کرنے کی کوئی صورت نہ تھی اور وہ یقیناً مارے جاتے۔ اس کے بعد انگریز انگلستان سے بڑی فوج لا کر ہندستان کو از سرِ نو فتح کرنے کے لیے اگر کوئی قدم اٹھاتے تو یقیناً اس میں کامیاب ہونا آسان نہ رہتا۔ لیکن ان سکھ ریاستوں کی انگریز دوستی اور وطن دشمنی نے صورتِ حال بگاڑ دی۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے مختلف وجوہ بیان کیے جاتے ہیں۔ مثلاً۔

۱۔ وہ اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ دہلی از سرِ نو مسلمان بادشاہوں کی تخت گاہ بن جائے۔

۲۔ ان کی مذہبی روایات میں یہ پیش گوئی موجود تھی کہ ایک وقت آئے گا جب سکھ فرنگیوں کی امداد سے دہلی کو فتح کریں گے۔

۳۔ انگریزوں نے سکھوں کو چکمہ دیا تھا کہ دہلی کا تخت ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔

افسوس ناک طرزِ عمل

ان میں سے ایک بھی وجہ کسی غیور قوم کے لیے باعثِ عزت نہیں سمجھی جا سکتی۔ ہندوستان میں مختلف قومیں آباد تھیں۔ ان میں سے تمام لوگ بہ یک وقت حکمران نہیں بن سکتے تھے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ کسی ایک کو بادشاہ تسلیم کر لیا جاتا۔ چونکہ مغلوں کی حکومت سوا تین سو سال سے چلی آتی تھی، اور زیادہ تر لوگ انہیں کے راج پر مطمئن تھے۔ اس لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ صرف مسلمان بادشاہ کی مخالفت کے جنون میں سکھ اپنے وطن کو اجنبی محکومی کی زنجیریں پہنانے کے لیے پیش قدمی کرتے۔

پیشگوئی والا افسانہ مضحکہ خیز بھی ہے اور لغو بھی۔ اس قسم کی اوہام طرازیاں انہیں قوموں کا شیوہ ہیں جو عزم و ہمت سے عاری ہو چکی ہوں۔ آخر سکھوں کی پہلی ناکامی کے بارے میں کیوں مذہبی روایات نے کچھ نہ بتایا؟ ۔۔۔ یہ کیوں نہ بتایا کہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ آپس میں لڑ جھگڑ کر فنا ہوں گے اور دلیپ سنگھ سے پنجاب چھن جائے گا! ۔۔۔ یہ کیوں نہ بتایا کہ سکھوں کے مقدر میں اپنی حکومت نہیں، بلکہ تنخواہ دار اور موجب خور کی حیثیت میں انگریزی سلطنت کے استحکام کی خدمت ہے۔ محض اس امر میں سکھوں کے لیے فخر کا کون سا پہلو تھا۔ کہ انگریزوں کو کامیاب بنانے کے لیے دہلی پہنچے ۔۔۔ لوٹ مار یا قتل و غارت کے بعد محکوم بن کر گھروں میں جا بیٹھے اور باقی ملک کو بھی محکوم بنا دیا۔

تیسری وجہ بھی سراسر لغو تھی ۔۔۔ جن لوگوں نے چکمہ دیا تھا۔ بہر حال مختار وہی رہتے تھے۔ ان کی مختاری کو پختہ کر کے دہلی لے لینے میں اعزاز کی کوئی بات نہ تھی، لیکن بعض دوسرے طبقوں کی طرح سکھ راجاؤں نے بھی اپنے لیے ایک دردناک ننگ قبول کیا اور اس کی وجہ سے ملک کو مزید نوّے سال کے لیل و نہار محکومی کی ذلت و نامرادی میں گزارنے پڑے۔

ساورکر کا تبصرہ

ساورکر نے لکھا ہے۔۔۔ کہ شہنشاہ دہلی نے ان ریاستوں کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے، جنہیں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ ان ریاستوں کو موقع حاصل تھا ۔۔۔ کہ انقلاب کی بنیادیں مستحکم کر دیتیں، یا اسے ختم کر ڈالتیں۔ یہ انبالہ اور دہلی کے درمیان واقع تھیں اور ان کی امداد کے بغیر انگریزوں کا عقب حفاظت سے بالکل محروم تھا۔ اگر یہ ریاستیں خاموش بیٹھی رہتیں جس طرح کہ دوسری خاموش بیٹھی رہیں تو اس حالت میں بھی انقلاب کی کامیابی کے خاصے امکانات موجود تھے۔ لیکن جب پٹیالہ، نابھ اور جیند نے انقلاب پر انگریزوں سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ ضربیں لگانی شروع کیں تو دہلی اور پنجاب کے درمیان تعلقات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان ریاستوں نے شہنشاہ دہلی کی دعوت ٹھکرا دی۔ جو رسول پیغام لے کر آئے تھے انہیں قتل کر دیا گیا۔ اپنے خزانے انگریزوں پر نثار کیے۔ اپنی فوجیں جمع کیں اور جن علاقوں میں سے انگریزوں کو گزرنا تھا۔ انہیں بچائے رکھا۔ پھر انگریزوں کے ساتھ ہو کر دہلی پر حملہ کیا۔ جب پنجاب کے انقلابی گھر بار چھوڑ کر قومی جھنڈے کی حفاظت کے لیے دہلی کی طرف روانہ ہوئے تو گرو گوبند سنگھ کے ان پیروؤں نے انہیں بے دردی سے اذیتیں بھی پہنچائیں اور قتل بھی کیا۔

ضروری انتظامات

بہر حال ان ریاستوں کی وجہ سے انگریزوں کی پوزیشن بہت بہتر ہو گئی۔ والی پٹیالہ نے اپنے بھائی کو فوج دے کر بھیجا۔ تاکہ تھانیسر والی سڑک کی حفاظت کرے۔ والی جیند نے پانی پت کی چوکی سنبھال لی۔ اس طرح نہ محض دہلی اور انبالہ کی سڑک ہی محفوظ ہو گئی بلکہ پنجاب سے انگریزوں کا ربط و تعلق بھی بدستور استوار رہا اور پنجاب ہی وہ علاقہ تھا جہاں سے دہلی پر کامیاب یورش کے لیے زبردست توپ خانہ اور لشکر بھیجا گیا تھا۔

اینسن کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ میرٹھ کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کرے اس غرض سے ایک من چلے آدمی کو بھیجنا لازم تھا جو مشکلات سے بے پروا ہو کر تمام خبریں میرٹھ پہنچائے اور وہاں سے ضروری پیغامات لے آئے۔ یہ کام ہوڈسن نے

انجام دیا۔ اُسے جنرل این سن نے کرنال بھیج دیا کہ وہ وہاں بے قاعدہ رسالہ بھرتی کرے۔ اُسی کو اس رسالے کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ کرنال کے نواب نے بھی انگریزوں کی امداد میں کوئی دقیقہ سعی اُٹھا نہ رکھا۔ حق یہ ہے کہ سکھ راجاؤں نے جو روش اختیار کی تھی اس کے بعد کسی کے لیے انگریزوں سے موافقت میں تامل کا موقع ہی کب رہا تھا۔

حملے کی تجویز

این سن نے غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ تین جیش دہلی پر پیش قدمی کریں ـــــ ایک انبالہ بریگیڈ نمبر ۱۔
دوسرا انبالہ بریگیڈ نمبر ۲۔
تیسرا میرٹھ بریگیڈ نمبر ۲۔

پہلے کا سالار بریگیڈیر ہیلی فیکس مقرر ہوا۔ دوسرے کا بریگیڈیر جونز اور تیسرے کا بریگیڈیر ولسن۔ پوری فوج میں تین ہزار گورے تھے، اور ایک ہزار دیسی سپاہی۔ ان کے ساتھ بائیس میدانی توپیں تھیں۔ انبالہ کے دونوں جیشوں کے لیے لازم قرار دیا گیا تھا کہ ۳۰ مئی تک کرنال پہنچ جائیں اور میرٹھ کا جیش باغ پت کے گھاٹ پر دریا کو عبور کرے پھر تینوں جیش مل کر آگے بڑھیں۔ یہ اطلاع میرٹھ پہنچا دی گئی تھی۔

این سن کی جگہ برنارڈ

جنرل این سن ۲۴ کو انبالے سے روانہ ہو کر ۲۵ کی صبح کو کرنال پہنچ گیا۔ ۲۶ کو وہ ہیضے میں مبتلا ہو گیا۔ ۲۷ کو سر ہنری برنارڈ انبالے سے کرنال پہنچا تو این سن پر نزع کی حالت طاری تھی۔ برنارڈ کو دیکھتے ہی اس نے پہچان لیا اور کہا۔

"برنارڈ! میں فوج کی کمان تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ تم اس امر کے گواہ رہو کہ میں اپنا فرض بجا لانے کے لیے کس درجہ مضطرب تھا۔ میں اب بچ نہیں سکتا۔ میری دعا ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو، خدا تمہیں برکت دے خدا حافظ"

۲۷ کو سوا دو بجے بعد دوپہر این سن نے وفات پائی۔ دیکھو یہ کتنا اچھا موقع تھا۔ اول تو انگریزی فوج بہت کم تھی، دوم وہ آگے بھی بڑھتی تو اس کے لیے کامیابی کی کوئی خاص امید نہ تھی۔ اور پیش قدمی کے دوران میں انگریز جرنیل وفات پا چکا تھا۔ برنارڈ نے بڑی ہمت سے کام لیا، اگرچہ بڑی توپیں نہیں پہنچی تھیں لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ پیش قدمی جاری رکھی جائے۔

جیش میرٹھ

جیش میرٹھ ۲۷ مئی کو روانہ ہوا، وہ راتوں کو سفر کرتا تھا۔ تین راتوں کے بعد ۳۰ مئی کو غازی آباد پہنچا چونکہ راستے میں اُسے کہیں بھی مزاحمت سے سابقہ نہیں پڑا تھا، اس لیے خیال تھا کہ وہ بآسانی منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ غنیم نے ایک بلند مقام پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ خبر ملی تو لشکر کو ہتھیار سنبھال لینے کا حکم بھی نہ دیا جا سکا کہ بھاری توپیں آگ برسانے لگیں۔ یہ جنگ ہنڈن ندی کے کنارے شروع ہوئی جو غازی آباد اور دہلی کے بیچ میں اوّل الذکر سے قریب بہتی ہے۔ اس پر سے گزرنے کے لیے لوہے کا پل بنا ہوا تھا۔

جنگ ہنڈن

انگریز سالار نے ایک دستہ اس پل کی حفاظت کے لیے بھیج دیا۔ یہ غنیم کے دائیں جانب تھا اور جنگی نقطۂ نگاہ سے اسے کلیدی مقام کی حیثیت حاصل تھی۔ ساتھ ہی ایک دستہ چار توپیں دے کر ندی کے کنارے کنارے دائیں جانب روانہ کر دیا۔ سخت گولہ باری ہوتی رہی، انگریزوں نے اعتراف کیا ہے۔ کہ غنیم کے توپ خانے نے بڑا اعلیٰ کام کیا ہے۔ لیکن انگریزی توپ خانہ قدم بہ قدم ترکی بہ ترکی جواب دیتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد غنیم نے مراجعت کی اور وہ پانچ توپیں، گولے اور دوسرا ساز و سامان انگریزوں کے قبضے میں چھوڑ گیا۔

دوسرے دن پھر ایک فوج جنگ کے لیے آئی۔ اس مرتبہ بھی توپوں کی آتش بازی کے بعد وہ واپس چلی گئی۔ لیکن جو توپیں پہلے دن انگریزوں کے قبضے میں رہ گئی تھیں وہ واپس لے لی گئیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ دہلی کی سپاہ تعداد میں خاصی بڑی تھی۔ اس کے پاس سامان بھی خاصہ تھا۔ لڑائی کی جگہ بھی اس نے اپنی مرضی سے منتخب کی تھی۔ پھر شدید گرمی کا موسم تھا، جس میں گوروں کے لیے لڑنا سخت مشکلات کا باعث تھا۔ بایں ہمہ وہ سپاہ واپس چلی گئی۔ یا کہنا چاہیے کہ پسپا ہو گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ وہی بات جو آئندہ بار بار پیش آئے گی کہ کہیں سپہ سالار موزوں نہ تھا اور کہیں سپاہیوں نے باقاعدہ تربیت نہیں پائی تھی۔ ایسی لڑائیاں شاید ہی ہوئیں جن میں ہندوستانی سپاہ اور ان کے سپہ سالار دونوں بلند حیثیت کے مالک تھے۔

مرزا معین الدین کا بیان

مرزا معین الدین حسن خان نے لکھا ہے کہ بادشاہ کو میگزین میں سے قریباً ایک لاکھ روپے کی قیمت کے ہتھیار مل گئے تھے لیکن بارود نہ تھی۔ اس کی تیاری کے لیے خاص احتیاط کی گئی۔ بادشاہ کا اصرار شروع ہی سے یہ تھا کہ میرٹھ پر حملہ کیا جائے تاکہ انگریز وہاں سے نکل جائیں۔ لیکن سپاہ لیت و لعل کرتی رہی۔ آخر بہادر شاہ کا پوتا شہزادہ مرزا ابوبکر ۲۵ مئی کو فوج لے کر انگریزوں سے لڑنے کے لیے نکلا۔ ہنڈن ندی کے آس پاس مورچے قائم کیے ـــــ اس فوج میں سوار بھی تھے۔ بڑی میدانی توپیں بھی اور چھوٹی توپیں بھی جو گھوڑوں پر سوار کی جاتی ہیں۔

لڑائی توپوں کی آتش باری سے شروع ہوئی۔ شہزادے نے ہنڈن کے کنارے پل کے قریب ایک مکان کی چھت اپنے لیے منتخب کر لی تھی۔ اور اس پر کھڑے ہو کر جنگ کا نظارہ کرتا رہا۔ پل سے قریب ایک بیٹری نصب تھی۔ اچانک گوروں کی ایک توپ کا گولہ بیٹری کے قریب پھٹا۔ جس سے توپچی گرد و غبار میں اٹ گئے۔

شہزادے کے لیے گولے کے پھٹنے کا یہ پہلا نظارہ تھا اس پر اتنا اثر ہوا کہ چھت سے اترا اور گھوڑے پر سوار ہو کر تیزی سے بھاگ نکلا۔ ہر چند اُسے روکا گیا لیکن نہ ٹھہرا۔ اس سے سراسیمگی پیدا ہو گئی اور سپاہ بھی بھاگ گئی۔ جب دہلی خبر پہنچی کہ سپاہ نے شکست کھائی تو حکم دے دیا گیا کہ دروازے بند کر دیے جائیں تاکہ میدان سے فرار ہونے والی سپاہ باہر ہی رہے۔ افراتفری میں گزرتے ہوئے پل بھی ٹوٹ گیا اور دو(۴) سو سپاہی ڈوب گئے۔ دوسرے دن انگریزی سپاہ نے ہنڈن کو عبور کر کے چھوڑی ہوئی توپوں پر قبضہ کر لیا۔ دہلی کی سپاہ دوبارہ لڑائی کے لیے نکلی اور میدان میں مقابلہ کیا۔ کامیابی کی امید تھی لیکن کچھ نہ بن سکا۔ منشی جیون لال نے بھی اس واقعہ کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔ اب دیکھیے اگر مرزا ابوبکر ذرا ہمت اور مردانگی سے کام لیتا یا سپہ سالارِ اعظم کی حیثیت سے فوج کے پیچھے رہتا تو اس کے فرار پر سپاہ میں سراسیمگی پیدا نہ ہوتی۔

فوجوں کا اتصال

دو روز کی جنگ نے جیش کو خاصا مضمحل کر دیا تھا۔ یکم جون کو گورکھا فوج میرٹھ سے آ ملی۔ یہ کمک بے حد غنیمت معلوم ہوئی۔ اب ولسن کو یہ پریشانی دامن گیر ہوئی کہ کیا کرے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی احکام کے سمجھنے یا پہچاننے میں کچھ غلطی ہو گئی تھی۔ ولسن کا خیال تھا کہ دہلی پر بیک وقت دونوں طرف سے حملہ ہو گا۔ ایک طرف سے برنارڈ کی فوج آگے بڑھے گی اور دوسری طرف سے خود ولسن جیش میرٹھ کے ساتھ پیش قدمی کرے گا۔ ۴ جون کو پھر خبر ملی کہ غنیم کا حملہ ہونے والا ہے۔ دفاع کی تیاری کر لی گئی۔ لیکن کوئی فوج

نمودار نہ ہوئی۔

۴ جون کو اطلاع آگئی کہ برنارڈ فوج کے ساتھ علی پور میں خیمہ زن ہو گیا ہے۔ اور جیش میرٹھ کو باغ پت کے گھاٹ سے دریا عبور کر کے ساتھ مل جانا چاہیے۔ ۶ جون کو محاصرے کی توپیں بھی آگئیں اور جنرل ولسن بھی با اطمینان دریا کو عبور کر گیا۔ اس کے بعد جنرل برنارڈ نے پیش قدمی کا حکم دے دیا۔

اب انگریزی فوج کی حیثیت اس سے کہیں بہتر اور مستحکم تر تھی۔ جبکہ اس نے انبالہ سے کوچ کیا تھا۔ جب این سن کی وفات پر برنارڈ نے کمان سنبھالی تھی۔ علی پور سے آگے بڑھتے ہی بادلی کی سرائے میں غنیم سے مڈبھیڑ ہوئی۔

دفاعی انتظامات

یہاں اس حقیقت پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ اگرچہ سپاہیوں کو اچھے جرنیل بہت کم مل سکے۔ خصوصاً دہلی میں اس جنس کا بے حد قحط تھا۔ لیکن وہ دفاعی ضروریات سے ناواقف نہ تھے۔ اور نہ غافل، میرٹھ کی جانب تو پیش قدمی کرنے کی تجویز خود بہادر شاہ بادشاہ بہ اصرار پیش کر چکا تھا۔ پھر جب معلوم ہوا کہ گورا سپاہ غازی آباد پہنچی ہوئی ہے۔ یا پہنچنے والی ہے تو مدافعت کے لیے فوج گئی۔ بلکہ بعد میں بھی یورشوں کا سرد سامان ہوتا رہا۔ انبالہ کی سمت سے بھی انگریزوں کی یورش کا قوی اندیشہ تھا۔ جب والیان پٹیالہ، جیند اور نابھہ نے قوم و ملک کا ساتھ چھوڑ کر انگریزوں سے رشتہ جوڑ لیا تھا تو یقین ہو چکا تھا کہ ادھر سے ضرور حملہ ہوگا۔ انگریزی پیش قدمی کی خبریں بھی ملتی رہتی ہوں گی۔ لہذا سپاہ دہلی کی طرف سے بادلی کی سرائے میں مدافعت کے انتظامات کر لیے گئے تھے۔ یہ مقام شہر دہلی سے کوئی آٹھ میل پر ہوگا۔

فارسٹ لکھتا ہے "سپاہ دہلی نے اس مقام پر حفظ و دفاع کے جو انتظامات کیے تھے، وہ پیش قدمی کرنے والی بڑی فوج کے مقابلے میں یقیناً موثر ہوتے۔ سرائے ان کے قبضے میں تھی۔ یہ کرنال، پانی پت اور علی پور سے دہلی جانے والی سڑک کے بائیں جانب واقع تھی۔ سرائے کی چار دیواری حصار کا کام دیتی تھی اور اس کا دروازہ بہت مستحکم تھا۔ اس کے اردگرد کیمپ تھا۔ سرائے کے سامنے سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ایک اونچی جگہ تھی۔ اس پر ریت کے بورے رکھ کر مورچہ قائم کر لیا گیا تھا جس پر چار بھاری توپیں اور ایک مارٹر رکھ دی گئی تھی۔ گویا سرائے اور بادلی گاؤں کے درمیان جو سڑک کی دائیں جانب تھا ایسے استحکامات کر لیے گئے تھے کہ انگریز فوج کے لیے گزرنا بہت مشکل تھا۔ سڑک کے دونوں طرف بہت سے کھالے تھے جن کی وجہ سے زمین صاف و ہموار نہیں رہی تھی۔ بلکہ خاصی دلدل بن گئی تھی۔ گاؤں سے بھی آگے مغربی جانب میل بھر یا اس سے کم فاصلے پر جمنا کی نہر بہہ رہی تھی۔ جس پر سے گزرنے کے لیے جا بجا پل بنے ہوئے تھے۔

بادلی کی سرائے کا معرکہ

انگریز سالار نے اپنی سکیم کے مطابق ایک جیش کو سڑک سے دائیں جانب اور دوسرے کو بائیں جانب بھیج دیا تاکہ وہ چکر کاٹ کر غنیم کے عقب میں پہنچ جائیں پھر خود براہ راست حملہ کیا۔ مجاہدین نے بڑی مردانگی سے جنگ شروع کی، لیکن انگریزوں کے پاس زیادہ بھاری توپیں تھیں جن کا جواب وہ نہ دے سکے چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں ان کی توپوں کا مورچہ اور سرائے انگریزوں کے قبضے میں آگئے۔

فارسٹ نے انگریزوں کی جنگ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ نہایت تیز و شدید تھی۔ مگر صرف تھوڑی دیر جاری رہی۔ سپاہی مردانہ وار لڑے اور گوروں نے سنگینیں مار مار کر انہیں ختم کر دیا۔

اگرچہ اس وقت تک بھی انگریزی فوج کی وضعیت خاصی پریشان کن تھی۔ اس لیے کہ جو جیش دائیں اور بائیں جانب سے پیچھے گئے تھے وہ نمودار نہیں ہوئے تھے۔ اچانک وہ بیک وقت سامنے آگئے۔ یوں دائیں بائیں اور سامنے کے حملے نے مجاہدین کو منتشر ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ لڑائی ۸ جون کو ہوئی۔

پیش قدمی

لڑائی میں اگرچہ انگریزی فوج تھک کر چور ہو چکی تھی، لیکن برنارڈ نے ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اُسے اندیشہ تھا کہ اگر تھوڑی سی بھی مہلت دے دی گئی تو مجاہدین پھر اکٹھے ہو کر حملہ آور ہو جائیں گے۔ اور دہلی کی طرف بڑھنا غیر ممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے فوج کے دو حصے کر لیے۔ خود ایک حصے کو لے کر پہاڑی کی جانب اس مقام کی طرف بڑھا جہاں انگریز چھاؤنی تھی اور دوسرے حصے کو ولسن کی سرکردگی میں پہاڑی کی غربی گوشے کی طرف سبزی منڈی کی جانب بھیجا۔ مقصود یہ تھا کہ اردگرد کے تمام مقامات کو مزاحمت سے پاک کر کے محاصرہ کا بندوبست کر لیا جائے پھر سوچا جائے کہ شہر میں داخلے کی کیا کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔

گورا فوج کا مقام

گورا فوج شہر دہلی کے شمالی حصے میں مقیم ہوئی تھی اور اس کی زد براہ راست کشمیری دروازے، موری دروازے اور کابلی دروازے پر پڑتی تھی۔ اگرچہ اثر لاہوری دروازے تک جاتا تھا۔

دہلی سے کوئی دو اڑھائی میل کے فاصلے پر شمالی جانب دو میل کے قریب ایک لمبی پہاڑی واقع ہے جس کی اونچائی ساٹھ فٹ کے قریب ہوگی۔ اس پہاڑی کے عقب میں انگریزی چھاؤنی تھی۔ اس مقام پر شہر کی طرف سے حملوں کا بھی خطرہ تھا، اور یہ خطرہ بھی تھا کہ دائیں جانب کے مورچوں کو توڑ کر سپاہی آگے بڑھیں گے تو انبالہ اور پنجاب سے گورا فوج کا تعلق منقطع ہو جائے گا۔ اسے محفوظ رکھنے کے لیے برنارڈ نے بڑے پختہ انتظامات کر لیے تھے۔

حفاظتی انتظامات

پرانی چھاؤنی کے اردگرد گورا فوج کا کیمپ تھا۔ جس مقام پر آج کل فتح کی یادگار میں مینار بنا ہوا ہے۔ وہاں توپوں کا ایک مورچہ تھا، یعنی سینے کے برابر تک دیوار بنا کر توپیں رکھی گئی تھیں تاکہ توپیں اور توپچی غنیم کی گولہ باری سے حتی الامکان محفوظ رہیں۔ یہ مورچہ شہر کی فصیل سے کوئی بارہ سو گز کے فاصلے پر ہوگا۔

اس کے شمالی جانب پہاڑ کی ڈھلان میں مارٹر توپیں نصب تھیں۔ ان توپوں سے ذرہ پیچھے ہٹ کر ہندو راؤ کا مکان تھا۔ یہ دراصل سنگین کوٹھی تھی اور اس کے باہر مضبوط دیوار بنی ہوئی تھی۔ ہندو راؤ گھوڑکے گوالیار کی مشہور رانی بیجا بائی کا بھائی تھا، اور یہ مکان پہاڑی کے جنوبی و مغربی حصے میں تھا۔ اس کے سامنے بھی توپوں کا ایک مورچہ تھا۔ اس سے شمالی سمت میں جہاں نما یعنی رصدگاہ، اور اس سے ذرہ آگے پٹھانوں کے عہد کی ایک مضبوط و مستحکم مسجد تھی۔ جس کا نام غالباً چوبرجی مسجد مشہور تھا، اس سے ذرہ آگے بادنما یعنی فلیگ سٹاف تھا۔ وہاں پیادوں کی ایک چوکی قائم کر دی گئی تھی، اور اس کے ساتھ دو توپیں تھیں غرض اس جگہ کو محفوظ کر دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ لیکن جنوبی و مغربی سمت یقیناً کمزور تھی۔ اس حصے میں پہاڑی کے ختم ہوتے ہی جرنیلی سڑک واقع تھی۔ توپوں کے پہلے بڑے مورچے کے عقب میں سبزی منڈی اور اس کے ملحقات تھے۔ یعنی مکانوں اور درختوں کے جھنڈ جن کی اوٹ میں سے ہو کر کسی وقت بھی یورش کی جا سکتی تھی۔ ذرہ آگے بڑھ کر پھر پہاڑی اوپر اٹھ آئی تھی، جس پر عیدگاہ بنی ہوئی تھی۔ دونوں کے بیچ میں جو ہموار جگہ تھی وہاں کشن گنج اور پہاڑی پور کی آبادی تھی

چھاؤنی والی پہاڑی اور شہر کے درمیان بہت سی پرانی عمارتیں درختوں کے جھنڈ اور باغات تھے۔ ان کی اوٹ میں سے بھی ہو کر مجاہدین کے لیے حملہ مشکل نہ تھا۔

شہر کی کیفیت

شہر کے اردگرد فصیل تھی جس کی لمبائی سات میل سے کم نہ ہو گی اور اونچائی کم از کم چوبیس فٹ تھی۔ یہ بڑی چوڑی اور مستحکم تھی، اور اس میں بہت سے برج اور گرگج بنے ہوئے تھے۔ جن میں سے ہر ایک پر بارہ بارہ، چودہ چودہ توپیں رکھی جا سکتیں تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ باہر کی طرف خاصی چوڑی اور قریباً چوبیس فٹ گہری خندق تھی۔ شہر کے مشرقی حصے کے ساتھ ساتھ دریا بہتا تھا اور اس طرف سے حملہ ممکن نہ تھا۔ باقی تین طرفوں میں سے صرف شمالی یا ایک حد تک مغربی سمت ہی پہ انگریز دباؤ ڈال سکتے تھے۔ جنوبی سمت ان کی دسترس سے بالکل باہر تھی۔ اس طرح مغربی سمت کے بڑے حصے کے خلاف بھی وہ کوئی اقدام نہیں کر سکتے تھے۔

جدال وقتال کا آغاز

۸ جون کو انگریزوں نے دہلی کے سامنے پہنچ کر اپنے مورچے قائم کیے۔ اسی دن وہ گگی فوج دہلی پہنچ گئی جس نے مردان اور یوسف زئی سے پانچ سو اسی میل کا فاصلہ بائیس دن میں طے کیا تھا اسی دن مجاہدین نے شہر سے نکل کر ہندو راؤ کی کوٹھی پر نہایت تیز و تند حملہ کیا۔ اور دست بدست لڑائی کی نوبت بھی آئی۔ بعد ازاں مجاہدین واپس چلے گئے۔ گوروں نے فصیل تک ان کا تعاقب کیا۔

دہلی میں آزاد حکومت قائم ہونے کے بعد انگریزوں کی کامیابی تک چار مہینے کی مدت میں کتنی لڑائیاں ہوئیں؟ اس سوال کا صحیح جواب دینا مشکل ہے۔ اس لیے کہ تعداد میں نمایاں اختلاف ہے۔ بعض اصحاب نے صرف بڑی بڑی لڑائیاں شمار کی ہیں۔ بعض نے تمام چھوٹی بڑی جھڑپیں گن لی ہیں۔ سید ظہیر دہلوی کے نزدیک کل سات لڑائیاں ہوئیں ان میں ہنڈن ندی کی لڑائی بھی شامل ہے اور بادلی کی سرائے کا معرکہ بھی جسے سید مرحوم علی پور کی جنگ قرار دیتے ہیں۔ لڑائیوں کی تفصیلات اور بعض تاریخوں کے باب میں بھی انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خود ناظر و شاہد نہ تھے۔ شہر کے اندر بیٹھے جو کچھ سن لیا تھا لکھ دیا۔ غالباً مولوی ذکاء اللہ مرحوم نے کل لڑائیاں بہتر یا تہتر بتائی ہیں اور یہ بیان زیادہ تر قرین صحت ہے۔ انگریزوں نے دوران محاصرہ میں جن لڑائیوں یا یورشوں کا ذکر کیا ہے ان کی صحیح تعداد میں متعین نہ کر سکا لیکن بیس کے لگ بھگ ضرور ہے۔ دو تین زیادہ ہی ہوں گی۔ کم نہ ہوں گی۔

اچانک حملے کا مسئلہ

جو انگریز شہر سے دور بیٹھے تھے ان کی رائے تھی کہ شہر پر فوراً حملہ ہونا چاہیے۔ وہ سمجھتے تھے کہ حملے کے ساتھ قومی قوت مختل ہو جائے گی۔ پھر سب کچھ سنبھال لینا مشکل نہ ہو گا۔ لیکن جو لوگ موقع پر موجود تھے وہ ہر شے کو حربی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس نقطۂ نگاہ سے فوری اور اچانک حملہ کامیابی کی مبالغہ آمیز توقعات کے باوجود خلاف دانش و تدبر تھا اس لیے کہ اول تو شکست کی حالت میں کوئی ایسی محفوظ فوج موجود نہ تھی جس کا سہارا لے کر شکست کے مضر اثرات سے بچاؤ کا بندوبست کیا جا سکتا۔ دوسرے شہر پر قبضہ کر لینے کے ممکنات سامنے رکھتے ہوئے بھی یہ امید نہ تھی کہ قبضہ سنبھال رکھا جا سکے گا۔

برنارڈ کا بیان

چنانچہ حملے کے متعلق انگریز افسروں میں ابتدائی مشورہ ہو چکا تو اگرچہ اس تجویز کو رد نہ کیا گیا۔ تاہم سپہ سالار برنارڈ کا خیال تھا کہ باہر بیٹھے ہوئے لوگ مجاہدین کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس نے ۱۳ جون کو لارڈ کیننگ کے نام جو خط لکھا اس میں صاف بتا دیا۔

> ”شہر اس درجہ مستحکم اور میرے وسائل اس حد تک ناکافی ہیں کہ حملہ یا باقاعدگی کے ساتھ شہر کے قریب پہنچنا یکساں مشکل بلکہ کہنا چاہیے غیر ممکن ہے۔ اور میرے لیے اس کے سوا راستہ نہیں کہ سب کچھ اس داؤ پر لگاتے ہوئے یورش کر دوں۔ اس کا میں مصمم ارادہ کیے بیٹھا ہوں۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن شکست مہلک ہو گی۔ اس لیے کہ میرے پاس محفوظ فوج نہیں جس کے سہارے پر پیچھے ہٹوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگوں نے حملۂ دہلی کی مشکلات کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ یہاں ہر دروازے اور آس پاس کے گرگجوں پر چوبیس چوبیس پونڈ کے گولے پھینکنے والی توپیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور توپچی ان کے چلانے میں خوب مشاق ہیں۔ ان میں اور ہم میں پانچ اور ایک کا فرق ہے۔ ہم نے صرف چھ بھاری توپیں مقابلے پر نصب کر رکھی ہیں اور ہماری توپیں غنیم کی توپوں کو بند نہیں کر سکتیں۔

حملے کی سکیم

حملے کی جو سکیم خاصے غور و فکر کے بعد تیار ہوئی۔ یہ تھی کہ کابلی دروازے اور لاہوری دروازے کے آس پاس بارود کے بورے رکھ کر انہیں اڑا دیا جائے۔ مدافعین کی توجہ اس طرف ہو جائے تو کشمیری دروازوں پر حملہ کیا جائے ــــ اور اسے توڑ کر شہر میں داخلے کا انتظام کر لیا جائے اس کے بعد فوج کو مختلف دستوں میں تقسیم کر کے پیش قدمی کی جائے ـــ دو دستے دائیں اور بائیں جانب سے فصیل کے ساتھ ساتھ بڑھیں اور تمام برجوں، گرگجوں دروازوں اور توپوں کو قبضہ میں لے لیں۔ باقی دستے شہر کے بڑے بازاروں میں سے قلعے کی جانب جائیں اس طرح یا تو مدافعین شہر سے باہر نکل جائیں گے یا قلعے میں جمع ہو جائیں گے۔ پھر انہیں ختم کرنا آسان ہو گا۔

بلاشبہ برنارڈ کے پاس فوج بہت کم تھی۔ اور حملے کی صورت میں خطرے زیادہ تھے مثلاً ایک نہایت زبردست خطرہ یہ تھا کہ مدافعین شہر سے باہر نکلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ تو اجتماعی صورت میں انگریزی کیمپ پر ہلہ بول دیں گے۔ وہاں دفاع کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس طرح انگریزی فوج ہر طرف سے منقطع ہو کر شہر میں محصور ہو جائے گی لیکن مختلف اہلِ نظر یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اگر حملے میں تاخیر ہوئی اور شہر جلد فتح نہ ہوا تو باہر سے مزید ساز و سامان اور فوجیں آتی جائیں گی اور مدافعین کی قوت میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جائے گا۔

دوسری جنگی کونسل

غالباً ۱۶ جون کو دوسری مرتبہ جنگی کونسل منعقد کی گئی۔ اس میں بعض افسروں نے یہ رائے ظاہر کی کہ تاخیر کا نتیجہ اچھا نہ ہو گا۔ مثلاً گریٹ ہیڈ کا اصرار تھا کہ تاخیر نہ کی جائے۔ دو ہفتے کی دیر کا نتیجہ یہ ہو گا کہ امیدیں ٹوٹ جائیں گی اور ملک میں فسادات پھیل جائیں گے احاطہ بمبئی کے مسلمان پہلے ہی مضطرب ہیں ان کے اضطراب میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور ہمارے دیسی حلیفوں کے دل میں بے اعتمادی کا بیج بو یا جائے گا۔ اکثریت کو اس رائے سے اختلاف تھا مثلاً ولسن نے کہا:

> ”شہر ایک میل چوڑا اور کشمیری دروازے سے دہلی دروازے تک دو میل لمبا ہے۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ اس میں داخل ہونے کے بعد مجھے کامیابی اور ناکامی دونوں سے سخت خوف آتا ہے۔ ہماری چھوٹی سی فوج جو صرف دو ہزار بندوقچیوں پر مشتمل ہے۔ شہر کی وسعت میں گم ہو جائے گی اور باغیوں نے ہمارے مورچوں پر مسلسل اور ہمت مردانہ حملوں سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ

آڑ میں بیٹھ کر کس خوبی سے لڑ سکتے ہیں اور کس طرح لڑیں گے۔ شہر پر حملے کی صورت میں گلیوں کے اندر انہیں جگہ جگہ آڑ مل جائے گی۔ اس وقت ہر باغی سپاہی ہر فرنگی کے برابر ہوگا۔ انہوں نے بھاری توپیں فصیل پر چڑھا رکھی ہیں (ان میں سے چالیس تک ہماری لائنوں پر حملے کی صورت میں بھی ہمیں سخت نقصان کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ ان کی توپیں فصیل کے آس پاس سات آٹھ سو گز کے رقبے میں خوب گراب چلا سکیں گی۔"

اس کے بعد کہا کہ سیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی حملہ مناسب نہیں کہا جاتا ہے کہ تاخیر کی صورت میں دیسی روؤسا ہمارے سرگرم حامی نہ رہیں گے۔

لیکن انہوں نے اب تک ہمارے لیے کیا کیا ہے؟ گوالیار اور بھرت پور کی فوجوں نے مدت سے ایسی روش اختیار کر رکھی ہے کہ ہمارے لیے اپنے وسائل کی بنا پر یورش کے بغیر چارہ نہیں رہا۔ جے پور کی فوج سے بھی ہمیں اُس وقت تک کوئی خاص امید نہ رکھنی چاہیے جب تک ہم باغیوں پر پوری فتح نہ حاصل کر لیں۔

تین جولائی

جب برنارڈ کے پاس مزید کمک پہنچ گئی۔ نیویل، چمبرلین اور بیرڈ سمتھ بھی آ گئے جو فوج میں ناموَر مانے جاتے تھے تو پھر شہر پر حملے کی تجویز زیر غور آئی۔ بلکہ ایک نقشہ بھی تیار کر لیا گیا۔ عین اس موقع پر اطلاع ملی کہ روہیل کھنڈ سے بخت خاں کے ساتھ جو فوج دہلی پہنچی ہے۔ وہ انگریزی چوکیوں پر زبردست حملہ کرنے والی ہے۔ برنارڈ نے خود لکھا ہے۔

یہ حملہ اول اس لیے ملتوی کرنا پڑا کہ خود ہم پر اسی روز بھاری فوج سے حملہ ہونے والا ہے۔ دوسرے چارلس نکلسن کی رجمنٹ میں سخت بے چینی پھیل گئی اور پوری رجمنٹ سے ہتھیار رکھوا لینے پڑے۔ نیز دو آدمیوں کو پھانسی بھی دے دی گئی۔ ایک اور رجمنٹ میں بھی بے چینی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ناقابل اعتماد آدمیوں کو نہ حملے کے دوران میں ساتھ لیا جا سکتا تھا۔ اور نہ پیچھے کیمپ کی حفاظت کے لیے چھوڑا جا سکتا تھا۔

مدافعین کی یورشیں

مدافعین نے محاصرہ کے دوران میں یورشوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا مثلاً ۹ جون کے حملے کے بعد ۱۰ جون کو انہوں نے اجمیری دروازے سے نکل کر انگریزی لشکر کے عقب میں حملے کی کوشش کی۔ ۱۲ جون کو انگریزی فوج کے میسرے پر بہت سخت یورش کی۔ ۱۷ جون کو انگریزوں نے مٹکاف ہاؤس پر قبضہ کر کے وہاں چوکی بٹھا دی۔ اسی دن معلوم ہوا کہ سامنے کی پہاڑی پر عیدگاہ میں کچھ سرگرمیاں جاری ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ مجاہدین وہاں توپیں جما کر انگریزی لشکرگاہ کو نشانۂ آتش بازی بنانا چاہتے ہیں، اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو انگریزوں کی حالت نہایت نازک ہو جاتی۔ ان پر جوابی حملہ کیا گیا اور عیدگاہ سے نکال دیا گیا۔ ۲۳ جون کو جنگ پلاسی کی سویں سالگرہ تھی۔ اس روز بڑا ہی سخت حملہ ہوا۔ بخت خاں کی فوج یکم یا دو جولائی کو دہلی پہنچی تھی۔ کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا تھا کہ انگریزی فوج میں سے زخمیوں کا ایک قافلہ انبالہ جا رہا ہے اور فیروز پور سے خزانہ و رسد لے کر ایک قافلہ پہنچ رہا ہے۔ اُسے روکنے کے لیے ۳ جولائی اور ۴ جولائی کی درمیانی شب میں بخت خاں چار پانچ ہزار آدمی لے کر نکلا اور رات کی تاریکی میں علی پور کی طرف بڑھا۔ ۴ جولائی کی صبح کو اس کا سراغ ملا۔ کوئی خاص لڑائی تو نہ ہوئی۔ بخت خاں کچھ سامان لے کر واپس آ گیا۔ فریقین کو معمولی نقصان پہنچا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز عقب کے دفاع کے متعلق بہت پریشان ہو گئے۔ انہوں نے نجف گڑھ والی نہر کے تمام پل تڑوا دیے صرف ایک باقی چھوڑا، جو ان کی لشکرگاہ سے قریب تھا۔

اسی طرح جولائی اور اگست میں یورشیں ہوئیں۔ کبھی ہندو راؤ کے مکان پر اور کبھی دوسرے مقامات پر۔ ۳۰ جولائی کو مجاہدین نے لڈلو کیسل پر قبضہ کر لیا اور ۸ ستمبر تک یہ مقام انہیں کے قبضے میں رہا۔ اس وجہ سے انگریزوں کو بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ اس مقام سے مٹکاف ہاؤس کی پکٹ پر سخت گولہ باری کی جاتی تھی۔ یکم اگست کو بقرعید تھی۔ نماز کے بعد مجاہدین نے ذبح عظیم کا اہتمام کیا کہ خود بھی راہِ حق میں جانیں دیں اور دشمن کو بھی تا بہ حدِ امکان نقصان پہنچایا۔ ان کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ پیش آئی کہ ۷ اگست کو کسی وجہ سے بارود خانے میں آگ لگ گئی۔ اس کے بعد یورشوں کا زور کم ہو گیا۔ بظاہر یہ بارود کی کمی کا نتیجہ تھا۔

بارود خانے کی تباہی

سید ظہیر دہلوی نے لکھا ہے کہ بارود خانہ چوڑی والوں کے محلے میں سمرو بیگم کی حویلی میں تھا۔ وہاں سات سو آدمی کام کرتے تھے، اور روزانہ سات سو من بارود تیار ہوتی تھی۔ ۷ اگست کو تین بجے بعد دوپہر آگ لگی اور ایسا دھماکہ ہوا جیسے ایک سو توپیں ایک ساتھ چلیں۔ سب کارکن اڑ گئے۔

> عزیز الدین خان، احسن اللہ خاں کے بھانجے گھبرائے ہوئے منتشر الحواس روتے ہوئے آئے، اور ان کے ہمراہ ان کے گھر کی سواریاں تھیں۔ خیر سواریاں تو گھر میں آ اتریں اور ان سے تفتیش حال کی، کہ خیر باشد کیا معاملہ ہے انہوں نے بیان کیا کہ ادھر تو میگزین اڑا ادھر پوربیے حکیم جی (حکیم احسن اللہ خان) کے گھر پر چڑھ گئے کہ حکیم جی انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں۔ انہوں نے میگزین اڑا دیا۔

یہ الزام درست ہو یا نہ ہو، لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ شہر میں انگریزوں سے ساز باز رکھنے والے آدمی موجود تھے۔ اور حکیم جی کے خلاف شبہ بالکل بے بنیاد نہ تھا۔

دہلی سے مراجعت کا مسئلہ

این سن کی طرح برنارڈ بھی ۵ جولائی کو ہیضے سے انتقال کر گیا۔ اس کی جگہ ریڈ مقرر ہوا۔ وہ صرف بارہ تیرہ دن کام کرنے کے بعد بیماریوں کے ہجوم کے باعث استعفا پر مجبور ہو گیا اور ۱۷ جولائی کو آرچ ڈیل ولسن نے سالاری کا عہدہ سنبھالا۔

اس عرصہ میں حملے کی بجائے یہ سوال سامنے آ گیا تھا کہ اتنی بڑی فوج کو کیوں اور کب تک شہر دہلی کے سامنے روک رکھا جائے اور کیوں محاصرہ چھوڑ کر دوسرے حصوں کی تسخیر کا انتظام نہ کیا جائے۔ ادھر سے فراغت کے بعد دہلی کا فیصلہ بہت سہل ہو گا۔ جو فوجی افسر پہلے دفعتاً حملہ کر کے شہر کے لینے پر زور دے رہے تھے ان میں سے بھی اکثر کی رائے یہی ہو گئی تھی۔ کہ محاصرے سے عارضی طور پر دستبردار ہو جانا بہتر ہو گا۔ البتہ بیرڈ سمتھ نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور کہا۔ کہ اگر ہم واپس ہوئے تو پورے ملک میں شور مچ جائے گا کہ ہم نے شکست کھائی ہے، اگر ہم بیٹھے رہے تو ہماری وجہ سے پنجاب کی حفاظت ہوتی رہے گی۔ پنجاب کے ساتھ حمل و نقل کے وسائل محفوظ رہیں گے۔ سرکشوں کی بہت بڑی قوت دہلی میں مجتمع رہے گی۔ اگر ہم پیچھے ہٹ گئے تو وہ لوگ مطمئن ہو کر ملک کے ہر حصے میں پھیل جائیں گے اور ہماری غیر محفوظ چوکیوں پر حملے شروع کر دیں گے۔

جنگ نجف گڑھ

محاصرے کے دوران کا آخری بڑا معرکہ نجف گڑھ میں ۲۵ اگست کو پیش آیا۔ نکلسن ۷ اگست کو دہلی آیا

تھا۔ پھر وہ اپنے متحرک کالم کو لینے کے لیے واپس گیا، جو اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ کالم کے پہنچ جانے کے بعد شہر پر حملے کے لیے تیاریاں ہوتی رہیں۔ فیروز پور سے بڑی توپیں منگوائی گئی تھیں۔ مدافعین کو بھی اس بات کا علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۲۴، اگست کو ان کی فوج اٹھارہ توپوں کے ساتھ محاصرے کی توپوں پر قبضہ جمانے کے لیے نکلی۔ اس میں در حقیقت فوجوں کے منتخب آدمی شامل تھے۔ ایک بریلی کی فوج دوسری نیمچ کی فوج۔ یہ فوج پہلے روز پالم پہنچی۔ دوسرے روز اس کا ایک حصہ جو نیمچ کے فوجیوں پر مشتمل تھا۔ بخت گڑھ چلا گیا۔ اگر اسے موقع مل جاتا۔ تو یقیناً محاصرے کی توپیں انگریزوں کے پاس نہ پہنچ سکتیں۔

نکلسن کو اس فوج کی روک تھام اور محاصرے کی توپوں کے بچاؤ کی غرض سے بھیجا گیا وہ پہلے ننگلوئی گیا۔ جو دہلی سے نو میل کے فاصلے پر تھا۔ پھر تفصیلات معلوم کر کے دوسرے دن چار بجے کے قریب بخت گڑھ پہنچ گیا۔ غنیم نے انگریزی فوج کی پیش قدمی کے راستے سے بائیں جانب دو میل میں مورچے قائم کر رکھے تھے۔ نکلسن نے اسی وقت حملہ کیا اور رات ہونے سے پیشتر بڑے حصے کو شکست دی۔ وہ خود لکھتا ہے۔ کہ بریلی کی فوج اس جنگ میں شامل نہ ہوئی۔ بلکہ پالم ہی میں رہی۔ اگر میرے پاس پوری خبریں فراہم کرنے والا کوئی آدمی ہوتا اور وقت پر اطلاع مل جاتی تو میں اگلے دن یعنی ۲۶ کو پالم پہنچ جاتا۔ اور بریلی کی فوج کو بھی برباد کر ڈالتا۔

بہر حال، اس طرح محاصرے کی توپوں کا راستہ محفوظ ہو گیا۔ اس سے دو روز پیشتر ہوڈسن نے اپنے بے قاعدہ رسالے کے ساتھ رہتک کی طرف پیش قدمی کر کے بشارت خاں رسالدار کے سواروں کو کھروہ میں شکست دی۔ پھر آگے نکل کر رانگھڑوں کے سردار بابر خان پر حملہ کیا۔ یہ تمام یورشیں اس غرض سے کی گئیں کہ خطوط نقل و حمل محفوظ رہیں اور دہلی کی طرف آنے والی کمک یا رسد یا ساز و سامان جنگ کو نقصان نہ پہنچے۔

چار مہینے اور چار دن

شہر پر انگریزوں کے آخری حملے اور تسخیر سے پیشتر چار مہینے چار دن کی آزاد شاہی حکومت چنداں خوشگوار نہیں، اور ارباب اختیار کے دل و دماغ کو نظم و ترتیب سے کوئی مناسبت تھی۔ یا وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے تھے۔ یا انہیں خیال تھا کہ عوام کو انگریزی دور کے مقابلے میں زیادہ آرام پہنچائیں یا اتفاق کی بنا پر انگریزی دور سے نجات کی جو صورت پیدا ہو گئی تھی اس میں استقلال و استحکام پیدا کرنے کی کوشش کریں؟ ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ بہادر شاہ اپنی عمر اور ضعف قویٰ کے باعث اس منصب کی ذمہ داریوں کو پورا نباہ کر سکتا تھا۔ جو اسے مل گیا تھا اور مغل شہزادوں میں سے ایک بھی صاحب جوہر نہ تھا لیکن بادشاہ کے فرزند یا قریبی ہونے کے باعث وہ ہر شے میں تقدم و سبقت کے حقدار بن گئے تھے۔ پھر یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ وقت کے حالات کی بنا پر نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے کارفرماؤں کی ضرورت تھی۔ اور یہاں چند قدم آگے دیکھنے والا بھی کوئی نہ تھا، بادشاہ ضعف کے علاوہ شہزادوں کے زور اور بیگم کے غلط مشوروں کے زیر اثر دب گیا تھا۔ شہزادے اگرچہ ہر شے پر قبضہ کرنے کے حریص تھے۔ مگر حرص کے سوا ان میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔

سپاہیوں کی حالت

سپاہیوں کی حالت بڑی عجیب تھی۔ وہ انگریز افسروں کو قتل کر کے آئے تھے اور ابتدا میں ان کے خیالات خواہ کچھ ہوں۔ لیکن ان کے دماغوں اور دلوں میں یہ بات جاگزیں ہو چکی تھی کہ وہ حقیقی قوت و طاقت کے مالک ہیں۔ جسے چاہیں بادشاہ بنا دیں۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ تلنگے بعض اوقات کہتے تھے۔

> بھیں ہم جاتی کے سر پہ منڈاسا رکھ دیں، وہی بادشا ہو جائی (بھائی) ہم جس شخص کے سر پہ تاج رکھ دیں۔ وہی بادشاہ ہو جائے۔۔۔

یہ قول غیر اغلب نہیں۔ خود بادشاہ نے اپنے بیان میں لکھا۔ کہ سپاہی مجھے تخت سے اتار کر مرزا مغل بیگ کو بادشاہ بنانے کے لیے تیار تھے۔ بعض بیانات میں بتایا گیا ہے کہ مرزا مغل نہیں، بلکہ مرزا ابو بکر کو بادشاہ بناتے تھے۔ چنانچہ تلنگوں کا یہ قول بھی منقول ہوا ہے۔

> بڈھو ماسر کے گولی مار دو۔ دوسرے منی کو بادشا کر دی جانی بڈھے۔
>
> یعنی بادشاہ کو گولی مار دو اور دوسرے کو بادشاہ بنا لو۔۔۔

سید ظہیر دہلوی نے لکھا ہے۔ کہ ایک مرتبہ ایک پوربیا فربہ اندام ادھیڑ، پچاس پچپن کی عمر کا، منہ پر داڑھی، گاڑھے کا کرتا، دھوتی بندھی ہوئی، سر پہ ایک انگوچھا لپٹا ہوا پنڈیا نکلی ہوئی آیا اور بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔

"سنو بڑھیو ہم نے تمہیں بادشا کیا" (سنو بڑے میاں ہم نے تمہیں بادشاہ بنایا) ان میں سے کوئی بھی امر تعجب انگیز نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان حالات میں نظم و نسق کیوں کر چلتا۔ پائیداری اور استحکام اختیار کر سکتا تھا۔ انتظام کرنے والوں کی کمزوری عوام پر واضح تھی اور عوام کی سینہ زوری انتظام کرنے والوں کو معلوم تھی۔

بادشاہ کی کم مایگی

بادشاہ صرف عمر اور قویٰ ہی میں کمزور نہ تھا بلکہ اس کے پاس کوئی بھی چیز نہ تھی۔ جو نظم و نسق کو چلانے میں معاون بن سکتی۔ نہ روپیہ پیسہ تھا۔ نہ ساز و سامان جنگ۔۔۔ نہ شہر میں بڑی فوج کے لیے رسد کا کوئی بندوبست تھا، نہ سپاہیوں کو تنخواہ دی جا سکتی تھی۔ ان حالات میں وہ سب پیش نظر مقاصد کے لیے جانبازی کی بنا پر زیادہ دیر تک کام نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ بعض نے لوٹ مار میں بھی تامل نہ کیا اور کھانے پینے کی چیزیں تو عموماً زبردستی ہی اٹھائی جاتی تھیں۔ بعض کے پاس اتفاقات کی بنا پر بہت بڑی رقمیں جمع ہو گئیں اور وہ نرخ سے زیادہ روپے دے کر اشرفیاں خریدتے رہے۔ تاکہ ان کے رکھنے میں سہولت رہے۔ بہر حال بادشاہ کی بے مائیگی اور تہی دستی نے حالات اور زیادہ نازک بنا دیے۔

صورت حال

اب انگریزوں کی پوزیشن خاصی مضبوط ہو چکی تھی۔ ان کے پاس جتنی کمک جلد از جلد پہنچ سکتی تھی پہنچ چکی تھی۔ ساز و سامان ہی نہیں، بلکہ محاصرے کی بڑی توپیں بھی آ گئی تھیں اور آخری فیصلہ کن حملے کا نقشہ انتہائی تیزی سے مکمل ہو رہا تھا۔ سفر مینا کے آدمی انجینیروں کی ہدایات کے مطابق جگہ جگہ توپیں نصب کر رہے تھے تاکہ حملے کی سکیم کے مطابق قلعہ شکن توپوں کی گولہ باری شروع ہو جائے۔

ضروری امور

اس کے برعکس مدافعین کی حالت اچھی نہیں رہی تھی۔ اس کے متعدد وجوہ تھے۔ مثلاً:

۱۔ فوج خاصی تعداد میں شہر کے اندر پہنچ چکی تھی۔ لیکن اس کے لیے رسد۔ تنخواہ اور دوسری ضرورتوں کا کوئی انتظام نہ تھا۔ شہر کی صرف جنوبی سمت سے رسد آ سکتی تھی۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ باہر سے بڑی فوج کے لیے روزانہ جنسیں خریدتے اور پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا۔۔۔

۲۔ سپاہی ضرورت کی بنا پر جہاں سے جو کچھ ملتا۔ جبراً لے لیتے تھے۔ اس وجہ سے اہل شہر میں اور سپاہیوں میں خیر سگالی کے تعلقات باقی نہیں رہے تھے۔

۳۔ بادشاہ نے بڑے بڑے عہدے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو دے دیئے تھے۔ یا کہیے کہ انہوں نے خود یہ عہدے سنبھال لیے تھے لیکن ان میں نہ کوئی صلاحیت تھی نہ وہ نظم و نسق کو چلانے کے اہل تھے، اور نہ ان میں کوئی اور جوہر تھا۔ جس کی وجہ سے سپاہ کی نظروں میں اعتماد حاصل کر سکتے۔

۴۔ بادشاہ کے گرد و پیش ایسے آدمی جمع ہو گئے تھے جو یا تو طبعاً انگریزی راج کی طرف مائل تھے۔ یا آزادی کے دعویداروں کی بدنظمیوں نے انہیں نتائج کے متعلق بدگمان کر دیا تھا۔ اور وہ بوڑھے بادشاہ کی رائے پر اثر انداز ہوتے رہتے تھے۔ مثلاً حکیم احسن اللہ خان، بیگم زینت محل، مرزا الٰہی بخش۔ بلکہ مختلف خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا الٰہی بخش اور بیگم نے خفیہ خفیہ انگریزوں سے نامہ و پیام بھی شروع کر دیا تھا۔

تفرقہ اور بے عملی

حقیقت یہ ہے کہ اولوالعزمی کے کام انتہائی محنت و مشقت اور جانبازی و سرفروشی کے محتاج ہوتے ہیں۔ عالمگیر کی ابتدائی نمایاں جنگ کھجوہ سے پیشتر دہلی میں ہو چکی تھی۔ جب جنگ کھجوہ میں اس نے سخت خطرات کے مقام پر لڑنا شروع کیا تو بعض ساتھیوں نے کہا کہ بادشاہ کو خطرات سے بچ کر رہنا چاہیے۔ عالمگیر نے جواب دیا کہ میں ابھی تک بادشاہ نہیں ہوا۔ البتہ ایسے کارناموں کی بدولت بادشاہی مل جاتی ہے۔ بہادر شاہ بے چارہ نہ مشقت و محنت کا عادی تھا۔ نہ اس کی عمر ایسی تھی کہ اس سے زیادہ سرگرمیوں کی امید رکھی جا سکتی۔ شہزادوں کی حالت اور بھی یاس افزا تھی۔ پھر مصیبت یہ تھی کہ جو آدمی کچھ کارنامے انجام دے سکتے تھے۔ انہیں مختاری کا درجہ حاصل نہ رہا جنہیں مختاری کی مسند پر بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ کچھ کر ہی نہ سکتے تھے۔

سب سے آخر میں یہ کہ بعض کوتاہ اندیش آدمیوں کی حماقت کے باعث شہر کی آبادی میں اک گونہ تفرقہ پیدا ہو چکا تھا جس سے انگریزوں اور ان کے بہی خواہوں نے پورا فائدہ اٹھایا —

تصدیقات

ان امور کی تصدیق ایسے اصحاب کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو موقع پر موجود تھے۔ اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے دانستہ غلط بیانی کی ہو گی۔ مثلاً مولانا فضل حق خیر آبادی کے تاثرات ملاحظہ فرمائیے!

۱۔ آمر و حاکم عمر کی کافی منزلیں طے کر کے بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکا تھا اور سچ پوچھیے تو آمر و حاکم ہونے کے بجائے اپنی شریک حیات اور وزیر کا محکوم تھا۔

۲۔ سردار ایسا ضعیف الرائے اور ناتجربہ کار تھا کہ کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ اس سے عجیب حرکتیں سرزد ہوتی تھیں۔ کوئی کام اپنی رائے سے نہیں کر سکتا تھا۔

۳۔ ناتجربہ کار سرداروں نے اپنے بعض عاقبت نااندیش سفیہ، خائن اور بزدل بیٹوں پوتوں کو امیر لشکر بنا دیا۔ یہ لوگ دیانتدار عقلمندوں سے متنفر تھے۔

۴۔ انہیں نہ تو میدان کارزار ہی سے کبھی واسطہ پڑا تھا۔ اور نہ کبھی شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا موقع ملا تھا۔ انہوں نے بازاری لوگوں کو اپنا ہم نشین و جلیس بنا لیا۔

۵۔ لشکر مختلف ٹولیوں میں تقسیم تھا۔ بعض گروہوں کا کوئی جرنیل ہی نہ تھا۔ بعض کو جائے پناہ بھی میسر نہ تھی۔ بعض کی طاقت فقر و فاقہ نے سلب کر کے ہاتھ پاؤں توڑ کے بٹھا رکھا تھا۔ بعض تھوڑا سا مال غنیمت ہاتھ لگنے کے باعث بے نیاز ہو گئے تھے۔

۶۔ مسلمانوں میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ نصاریٰ کا جانی دشمن تھا۔ دوسرا گروہ ان کی محبت میں اس درجہ غلو رکھتا تھا کہ اس نے ہندوستانی لشکر کی بربادی مجاہدین کے قلع شرکت کی غداری اور ان کے قلع قمع میں مکر و حیلے سے کام لینے میں کسی نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

اس پریشان کن ماحول، اس ناسازگار فضا اور ان حوصلہ فرسا مواقع کے باوجود مجاہدین نے جو کچھ کیا وہ یقیناً بڑا ہی حیرت انگیز اور قابل صد ستائش ہے۔

انگریزوں کی حالت

قیادت عالیہ کی صلاحیت کے اعتبار سے انگریزوں کی حالت بھی قطعاً باعث رشک نہ تھی۔ پہلے اینسن سپہ سالار تھا۔ بہت سے جوشیلے انگریز اسے بے عملی اور افسردہ دلی کے طعنے دیتے رہے پھر ہنری برنارڈ نے سپہ سالاری کا عہدہ سنبھالا اس نے اگرچہ بادلی کی سرائے کا معرکہ جیتا تھا لیکن دہلی پہنچ کر محاصرے پر قناعت کر بیٹھا۔ اس لیے اس پر بھی نکتہ چینی ہوئی۔ جب ولسن سپہ سالار بن گیا۔ تو نہ صرف اس کی جگہ ایک خاصے فوجی گروہ کی رائے یہ تھی کہ دہلی کے محاصرے میں انگریزی فوج کو معطل بنا کر بٹھائے رکھنا فضول ہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ محاصرہ چھوڑ دیا جائے۔ اور اس فوج سے دوسری جگہ کام لیا جائے۔ بعض افسروں کی مخالفت کے باعث اس رائے پر عمل نہ ہو سکا۔ لیکن ولسن آخری وقت تک فیصلہ کن حملے میں متذبذب تھا جب نکلسن پہنچ گیا اور اس نے ولسن کا تذبذب دیکھا تو رابرٹس کے بیان کے مطابق نکلسن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ فوجی کونسل میں ولسن کو کمان سے معزول کر دینے کی تجویز پیش کر دے رابرٹس نے جب نکلسن کو بتایا کہ نیویل چیمبرلین زخمی ہے اور اس کے بعد کمانداری کے لیے آپ کا نمبر آتا ہے تو نکلسن نے جواب دیا کہ میں انکار کر دوں گا۔ اور کیمبل کی کمانداری کی تجویز پیش کر دوں گا۔ گویا مقصود ذاتی ترقی نہیں مقصود صرف یہ ہے کہ دہلی کی تسخیر میں تامل نہ کیا جائے۔ —

حملہ ہو جانے کے بعد جب ابتدائی دنوں میں زیادہ پیش قدمی نہ ہو سکی تو ولسن اس وقت بھی مراجعت کا حکم دینے پر آمادہ تھا۔ نکلسن زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا تھا۔ اسے جب علم ہوا تو بولا — ابھی مجھ میں اتنی قوت ہے کہ ولسن کو گولی سے اڑا دوں۔ غرض یہ ہے کہ انگریزوں کی حالت بھی مجاہدین سے بہتر نہ تھی۔ لیکن ان کی فوج میں سپہ سالاروں کے علاوہ قابل اور ہمت ور فوجی افسر موجود تھے۔ جنہوں نے نقشۂ جنگ بگڑنے نہ دیا۔ مجاہدین میں جو قابل اصحاب تھے۔ انہیں غالباً کوئی قدم اٹھانے کا موقع ہی نہ دیا گیا۔

قلعہ شکن توپوں کے مورچے

جب کمک کے علاوہ قلعہ شکن توپیں بھی پہنچ گئیں تو انگریزوں نے فیصلہ کن حملے کا عزم کر لیا۔ چنانچہ بیرڈ سمتھ اور الگزینڈر ٹیلر نے حملے کا منصوبہ تیار کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ حملہ شہر کے شمالی حصے پر کیا جائے یعنی موری دروازے، کشمیری دروازے اور پانی کے مورچے کی سمت سے۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ حملہ آور فوج کا میسرہ دریا کی وجہ سے محفوظ تھا اور میمنہ کی حفاظت ہندو راؤ کے مکان اور آس پاس کے مورچوں کے ذریعے سے ہو سکتی تھی۔ میلی من نے لکھا ہے کہ مجاہدین نے اس حصے کے استحکام پر توجہ نہ کی۔ اگر یہاں کے کھنڈروں پر دمدمے بنا کر توپیں لگا دی جاتیں اور مسلسل گولہ باری ہوتی رہتی تو حملہ آور فوج کو بڑی مشکلات سے سابقہ پڑتا۔

> باغی لیڈروں نے اس موزوں مقام سے فائدہ اٹھانے میں معمول کے مطابق غفلت برتی۔ اس طرح متعدد سابقہ مثالوں میں ایک اور مثال کا اضافہ ہو گیا کہ ان کے مشوروں میں کوئی واقعی لائق کماندار موجود نہ تھا۔ یہ غفلت دفاع کے لیے مہلک ثابت ہونے والی تھی۔ کیونکہ محاصرین کو اپنی گولہ باری ویران حصوں پر مرتکز کر دینے کا موقع مل گیا جس سے مدافعین کی گولہ باری بند ہو گئی۔ جگہ جگہ فصیل میں شگاف ڈال دیئے گئے۔ جن سے پیادہ فوج شہر

کے اندر پہنچائی جا سکتی تھی۔

توپوں کے چار دمدمے

انگریزوں نے خوب دیکھ بھال کے بعد چار جگہ توپوں کے لیے مورچے تجویز کیے۔ اور ۷، ستمبر سے ان کے لیے کام شروع ہو گیا۔

۱. مورچہ نمبر ۱، اس کے دو حصے تھے۔ ایک دایاں، دوسرا بایاں۔ دائیں حصے کی توپوں کا مقصد یہ تھا کہ موری دروازے کے گرد گج کی توپوں کو خاموش کرا دیں۔ بائیں حصے کی توپوں کو کشمیری دروازے کے گرد گج پر گولہ باری کرنی تھی۔ پہلے دائیں جانب کا حصہ تیار ہوا اور گولہ باری شروع کر دی گئی۔ پھر بائیں جانب کے حصے کی درستی ہونے لگی۔ لیکن ایک ہی توپ نصب ہو سکی تھی کہ مدافعین نے انگریزوں کے منصوبے کا اندازہ کر لیا اور اس دمدمے پر مینہ کی طرح گولے برسنے لگے۔

آتش باری اس درجہ مسلسل اور خوفناک تھی کہ جس آدمی نے بھی مورچے کی پناہ گاہ سے سر اٹھایا۔ وہ ضرب سے محفوظ نہ رہ سکا۔

بلکہ ایک چھوٹا سا دستہ لاہوری دروازے کے راستے ان توپوں پر قبضہ کرنے کی غرض سے بھیج دیا گیا۔ لیکن دوسرے انگریزی مورچوں کی آتش باری نے اسے مراجعت پر مجبور کر دیا۔ اس مورچے میں ریت کے جو بورے رکھے تھے۔ انہیں ایک موقعہ پر آگ لگ گئی جو بڑی مشکل سے بجھائی جا سکی۔

۲. مورچہ نمبر ۲، ۷ ستمبر ہی کو لڈلو کیسل اور قدسیہ باغ پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ دوسرا مورچہ ان دونوں مقاموں کے قریب تھا۔ پہلے دمدمے کی طرح اس کے بھی دو ہی حصے تھے۔ یہ آہستہ آہستہ ۸۔ ۹ اور ۱۰ ستمبر کو راتوں کی تاریکی میں تیار ہوا اور گیارہ ستمبر کو اس سے گولہ باری شروع ہو گئی۔

۳. مورچہ نمبر ۳، اس کے لیے چنگی خانے کی ایک بیرونی عمارت تجویز کی گئی۔ جو پانی کے مورچے سے صرف ایک سو ساٹھ گز تھی۔ خدا معلوم مدافعین نے اسے کیوں غیر محفوظ چھوڑ دیا تھا۔ اس مورچے کی تیاری میں بھی انگریزوں کے بہت سے آدمی مارے گئے۔

۴. مورچہ نمبر ۴، یہ قدسیہ باغ میں ایک محفوظ و موزوں مقام پر تھا۔

گولہ باری اور شگاف

چاروں مورچوں سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ ۱۳ ستمبر کو بعد دوپہر معلوم ہوا کہ فصیل میں دو ایسے شگاف پڑ گئے ہیں جن سے فوج گزر کر اندر داخل ہو سکتی ہے۔ لیکن ضروری تھا کہ ذمہ دار افسر موقع پر پہنچ کر ان شگافوں کا صحیح اندازہ کر لیں۔ اور جانچ لیں کہ آیا واقعی ان میں داخلہ ممکن ہو گا۔ نیز ان کے سامنے کی زمین کے متعلق ضروری معلومات فراہم کر لیں۔ تاکہ فوج کو پیش قدمی میں ہر ممکن سہولت رہے۔

چنانچہ شعبۂ انجنیری کے چار افسر اس کام کے لیے تجویز ہوئے۔ دو کو کشمیری گرگج کی طرف اور دو کو پانی کے مورچے کی طرف بھیجا گیا۔ اندھیرا ہو گیا تو دو افسر دیکھنے کے لیے آگے بڑھے۔ مدافعین کو پتا چل گیا۔ اور انھوں نے آتش باری شروع کر دی آخر یہ کام دس بجے شب کے بعد پر ملتوی کر دیا گیا۔ اس اثنا میں توپچیوں کو ہدایت کر دی گئی کہ مسلسل گولے برساتے رہیں اور ٹھیک دس بجے بند کر دیں۔ غرض خوب دیکھ بھال کے بعد اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ شگافوں میں سے داخلہ ممکن ہے۔ اب حملے کے لیے تیاری شروع ہو گئی۔

حملہ آور فوج کی تقسیم

حملہ آور فوج کو پانچ کالموں میں تقسیم کیا گیا۔

۱. کالم ایک ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا اور جنرل نکلسن کو اس کا کماندار بنایا گیا۔ اس کا مقصد یہ قرار پایا کہ کشمیری دروازے کے گرگج سے قریب جو شگاف ہے اس میں سے اندر داخل ہو۔

۲. کالم ۲، اس میں آٹھ سو پچاس آدمی تھے۔ اور بریگیڈیر ولیم جونز کو اس کا سالار مقرر کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پانی والے مورچے کے پاس جو شگاف ہو اس میں سے داخل ہو۔

۳. کالم ۳، اس میں نو سو پچاس آدمی تھے۔ اور کرنل کیمبل اس کا افسر اعلیٰ مقرر ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جب کشمیری دروازے کو اڑا دیا جائے تو یہ اس میں سے اندر جائے۔

۴. کالم ۴، اس میں آٹھ سو آٹھ آدمی تھے لیکن کشمیر کے بارہ سو آدمی بھی اس کے ساتھ رکھے گئے۔ اس کالم کا سالار میجر ریڈ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کشن گنج پر حملہ کرتا ہوا لاہوری دروازے سے شہر میں داخل ہو۔

۵. کالم ۵، یہ ریزرو کالم تھا اور بریگیڈ لونگ فیلڈ اس کا کماندار تھا۔ اس کا کام یہ تھا۔ کہ ریزرو کے طور پر کالم ۱ کے پیچھے پیچھے جائے۔

پانچوں کالموں کا عمومی چارج جنرل نکلسن کے حوالے کیا گیا تھا۔

ولسن کی ہدایات

ولسن نے حملہ آور فوج کو ہدایات دیتے وقت سب سے پہلے یہ یاد دلایا کہ دیکھو تمہارے افسر، تمہارے ساتھی، تمہاری بیویاں اور بچے بڑی بے دردی سے مارے گئے۔ تاہم اگر عورتیں اور بچے تمہارے سامنے آئیں تو انہیں بچا لینا لیکن باغیوں کو ہرگز پناہ نہ دینا۔

اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ فوج خوب مشتعل ہو جائے۔ دوسرے ولسن کو اور ہر انگریز کو معلوم تھا۔ کہ نہ تمام "باغی" انگریز عورتوں، بچوں یا مردوں کے قاتل تھے، نہ مقابلہ کرنے والے کے سوا کسی کا قتل "اخلاقاً" یا "قانوناً" جائز تھا۔ نہ عورتوں اور بچوں کے سوا دلی کا ہر فرد باغی تھا۔ گویا اس ہدایت ہی میں ایک لحاظ سے قتل عام کی نہ صرف اجازت دے دی گئی تھی بلکہ اس کے لیے تاکید کر دی گئی تھی۔

حملے

۱۴ ستمبر کی صبح کو تمام کالم بالکل تیار ہو گئے۔ یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ جب پہلا اور دوسرا کالم حملہ کر دیں تو ایک دستہ جا کر کشمیری دروازے کو اڑا دے۔ تاکہ تیسرے کالم کے لیے بھی آگے بڑھنے کا راستہ کھل جائے۔

تمام کالم لڈلو کیسل کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گئے تھے۔ پھر پہلا کالم قدسیہ باغ میں جا کر کھڑا ہوا۔ نکلسن نے پیش قدمی کا اشارہ کیا۔ اگرچہ مدافعین کی طرف سے سخت گولہ باری ہو رہی تھی۔ لیکن کالم کے سپاہی نقصان اٹھاتے ہوئے بھی خندق سے گزر کر اندر پہنچ گئے۔ اسی اثنا میں دوسرا کالم پانی والے مورچے کے شگاف سے گزر گیا۔ کشمیری دروازہ اڑ گیا۔ تو تیسرا کالم بڑھا اور چاندنی چوک میں سے ہوتا ہوا۔ شاہی مسجد کے سامنے پہنچ گیا۔ چوتھے کالم کو سخت ناکامی ہوئی۔ نکلسن کا کام بھی رک گیا۔ اس لیے کہ آگے گولوں اور گولیوں کا مینہ برس رہا تھا۔ یہیں نکلسن کو گولی لگی۔ اور وہ بے بس ہو کر گرا۔ باقی کالموں کی پیش قدمی بھی رک گئی۔

۱۴ر کی شام کو یہ کیفیت تھی کہ پانی والے مورچے سے کابلی دروازے تک فصیل کے ساتھ ساتھ کا حصہ پہلے اور دوسرے کالم کے قبضے میں تھا۔ تیسرا کالم جامع مسجد تک پہنچنے کے بعد لوٹا۔ اور بیگم کے باغ میں ٹھہرا۔ پھر وہاں سے بھی پیچھے ہٹ آیا۔ چوتھا کالم شکست کھا چکا تھا۔

۱۵، اور ۱۶، ستمبر

اب پھر ولسن تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ حملہ آور فوج کو واپس بلا لے۔ لیکن بیرڈ سمتھ

نے اسے رد کا اور کہا کہ ہم جو مقام حاصل کر چکے ہیں اسے ہر حال میں سنبھالے رکھنا لازم ہے۔ ۱۵ اور ۱۶ ستمبر کو بھی جنگ ہوتی رہی۔ ۱۶ کو کشن گنج کا تخلیہ ہو گیا۔ ۱۷ اور ۱۸ کو بھی آہستہ آہستہ پیش قدمی جاری رہی۔ ۱۸ کی شام کو مزاحمت کا زور کم ہو گیا۔ ۲۰ کو لاہوری دروازہ بھی فتح کیا گیا۔ اور اسی دن میجر ریڈ چاندنی چوک میں سے ہوتا ہوا شاہی مسجد پہنچ گیا۔ اس وقت لال قلعہ پر حملہ ہوا اور ۲۰ ستمبر کو اس پر بھی قبضہ ہو گیا۔

جامع مسجد کا معرکہ

مسجد کے اندر جو مسلمان تھے ان کے پاس تلواریں تھیں، بندوقیں نہیں تھیں۔ ایک شخص نے پکار کر کہا۔ کہ بھائیو! امتحان کا وقت آ گیا۔ انگریز مسجد کو بارود سے اڑا دینا چاہتے ہیں۔ تم میں سے کون کون اسے بچانے کے لیے جان دینے پر آمادہ ہے۔ سب ساتھ ہو گئے، اور نعرہ ہائے تکبیر لگاتے ہوئے شمالی دروازہ سے اتر کر مقابلے پر آ گئے۔ انگریزوں کے حملہ آور دستے کے آگے آگے منکاف تھا۔ اس نے گولی چلانے کا حکم دیا۔ پہلی آتش باری میں دو سو مسلمان شہید ہوئے۔ اس اثنا میں باقی مسلمان انگریزی جیش کے پاس پہنچ گئے۔ اور تلوار کے دار شروع کر دیے۔ انگریزی فوج بھاگی اور کشمیری دروازے کے گرجا تک مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا۔

مرقع عبرت

۲۰ ستمبر کو بعد دوپہر دلسن لال قلعے میں پہنچ گیا۔ اور دیوانِ خاص کو اس نے اپنا صدر مقام بنایا۔ اس دن شراب کے ذریعے سے دیوانِ خاص میں ملکہ وکٹوریہ کا جامِ صحت نوش کیا گیا۔ لال قلعہ ۱۶۴۸ء میں مکمل ہوا تھا۔ دو سو نو سال کے بعد اس کے در و دیوار نے پہلی مرتبہ ایک اجنبی حکمران کا جامِ صحت تجویز ہونے کی صدا سنی۔

لال قلعے کا ترک

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے دہلی پر فیصلہ کن حملہ کیا تھا۔ دو دو روز تک وہ نمایاں پیش قدمی نہ کر سکے۔ جب انہیں روکنے کی تدبیریں ناکام ہو گئیں، تو اہل شہر نے جنوبی سمت کے تین دروازوں یعنی اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ سے نکلنا شروع کر دیا ۱۶ ستمبر کو بہادر شاہ خود ہوادار میں بیٹھ کر فوج کے ساتھ نکلا کہ انگریزی فوج کا مقابلہ کرے، اور قلعہ سے کوئی دو سو گز لال ڈگی کے پاس ٹھہرا۔ انگریزی فوج کی گولیاں وہاں تک آ رہی تھیں۔ اس لیے افسران فوج نے عرض کیا کہ یہاں حضور کا ٹھہرے رہنا مناسب نہیں۔ ۱۹ ستمبر کو شہر کا بڑا حصہ انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔ تو بادشاہ کو بھی یہی مناسب معلوم ہوا کہ لال قلعے سے نکل کر باہر چلا جائے۔

بخت خاں کا مشورہ

بخت خاں سپہ سالار نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا۔ انگریزوں نے اگر دہلی کو فتح کر لیا ہے تو مضائقہ نہیں۔ ہمارے لیے ہندوستان کھلا پڑا ہے۔ میرے ساتھ تشریف لے چلیے۔ جا بجا ازسرِ نو جنگ کریں گے۔ شہر لڑائیوں کے لیے مناسب مقام نہیں ہوتے اور شہر دہلی کا موقع اور محل تو خاصا خراب تھا۔ شہر نشیب میں تھا۔ انگریزی فوج پہاڑی پر اونچی جگہ تھی۔ جتنی دیر بھی ہم نے مقابلہ کیا وہ بڑی غیر معمولی بات تھی۔ نیز آپ نے مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کو سپہ سالار بنا رکھا تھا۔ جنہیں فنونِ جنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ باہر سے رسد ملنا بھی سہل نہ تھا۔ اگر ہم باہر نکل جائیں گے تو بہت کچھ کر سکیں گے۔ بادشاہ بخت خاں کی تقریر سے بہت متاثر ہوا اور کہا اب تو ہم ہمایوں کے مقبرے میں جاتے ہیں۔ کل وہاں آ کر ملو گے تو آئندہ کے متعلق آخری فیصلہ کر لیا جائے گا۔

بہادر شاہ کی شخصیت اور ماحول

کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ اس مشورہ پر عمل پیرا ہونے کے بعد نتیجہ حسب مراد نکلتا یا نہ نکلتا، البتہ مشورہ ہر لحاظ سے صائب تھا۔ گزشتہ چار مہینے میں جو واقعات پیش آ چکے تھے۔ انہیں مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دینا صریحاً ہلاکت کو دعوت دینا تھا۔ نیز بادشاہ نے اختیاراً یا اضطراراً جس جہادِ آزادی سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا تھا۔ اس کی عزت و آبرو کا تقاضا یہی تھا، کہ وہ آخری دم تک مقابلے پر ثابت قدم رہتا۔ یقیناً اس طرح دہلی کی تسخیر انگریزوں کے لیے بڑی حد تک بے معنی ہو جاتی اور ملک کی وسعت میں جو قوتیں انتظار کر رہی تھیں کہ جنگِ دہلی کے نتائج دیکھ لینے کے بعد کوئی قدم اٹھائیں۔ وہ بادشاہ کے باہر نکلتے ہی مقابلے کے لیے میدان میں نکل آتیں، اور انگریزوں کے لیے اس طوفانِ عظیم کی روک تھام سہل نہ رہتی۔ لیکن اس اقدام کے لیے جس عزم و ہمت، جس جانفشانی و جانبازی کی ضرورت تھی وہ بہادر شاہ میں موجود نہ تھی، پھر وہ عمر کی بیاسی منزلیں طے کر چکا تھا۔ وہ عالمگیر اعظم نہ تھا جو نوے سال کی عمر میں بھی جا کر قاہرہ کے ساتھ قلعوں یا علاقوں کی تسخیر یا سرکشوں کی سرکوبی کی غرض سے کوہ پیمائی اور دشت نوردی کے لیے مستعد رہتا تھا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کا ماحول عزم و ہمت کے ہر کام اور ہر عمل کے لیے حد درجہ ناسازگار تھا۔

زینت محل اور الٰہی بخش

اس کی چہیتی بیگم زینت محل برابر یہ کوشش کر رہی تھی کہ بادشاہ انگریزوں سے بات چیت کر کے معاملہ ختم کر دے۔ بیگم کو اپنی اور اپنے بیٹے جواں بخت کی حفاظت کا بہترین ذریعہ یہی نظر آتا تھا۔ پھر بیگم پر مرزا الٰہی بخش کی باتوں کا خاص اثر تھا جو انگریزوں سے ساز باز کر چکا تھا۔ مرزا الٰہی بخش کو باسورتھ سمتھ نے میجر ہڈسن کا تنخواہ دار لکھا ہے۔ گویا انگریزوں سے اس کے خصوصی تعلق میں کلام کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ لیکن اس بیان سے قطع نظر کرتے ہوئے خود انگریزوں نے لکھا ہے۔ ۱۴ ستمبر کی انگریزی یورش کے بعد مرزا چاہتا تھا کہ انگریزوں کی کوئی بہت بڑی خدمت انجام دے کر ان کی نظروں میں اعتبار حاصل کر لے اور بادشاہ کو گرفتار کرا دینے سے بڑی خدمت کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

چنانچہ اس نے بادشاہ کو سمجھایا کہ اگر آپ سپاہ کے ساتھ چلے جائیں گے تو بڑی مصیبتیں اور آفتیں جھیلنی پڑیں گی۔ اور سپاہیوں کی شکست بہرحال یقینی ہے۔ اس وقت آپ انگریزوں کے سامنے کوئی عذر پیش نہیں کر سکیں گے، اور باغیوں نے جو کچھ کیا ہے اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہو گی۔ لیکن اگر آپ اس وقت ان سے الگ ہو جائیں گے تو کہہ سکیں گے۔ کہ آپ ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ کوئی وجہ نہیں کہ انگریز اس معقول عذر کو قبول نہ کریں۔ نیز باہر نکلیں گے تو پردہ نشین بیگمات، شہزادیوں اور شہزادوں کو کہاں کہاں لیے پھریں گے۔ آخر میں یہ بھی کہا۔

> آپ باغیوں کے ساتھ تشریف نہ لے جائیں۔ میں انگریزوں سے مل کر تمام معاملات کی صفائی کرا دوں گا، اور آپ پر یا آپ کی اولاد پر ایک حرف نہ آنے دوں گا۔[۱]

باسورتھ سمتھ نے لکھا ہے۔ کہ مرزا الٰہی بخش کی رگ رگ اور نس نس میں غداری رچی ہوئی تھی۔ وہ ہڈسن کا تنخواہ دار تھا۔ اور اس کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ نہ جانے دے بلکہ ہمایوں کے مقبرے میں روکے رکھے، پھر ہڈسن کے حوالے کر کے اپنی اس عظیم الشان خدمت کی قیمت وصول کرے۔

منشی رجب علی

سرکار انگریزی کے جو ایجنٹ اس مخبری کے لیے کہ دشمن کیا حرکتیں کر رہا ہے دہلی میں رہتے تھے۔ ان سب کے سردار منشی رجب علی تھے۔ جاسوسی کے لیے جو اعلیٰ درجے کی لیاقتیں چاہئیں وہ ان میں تھیں۔ انگریز منتظموں کو ان پر پورا اعتماد تھا۔ سچی بات دریافت کر لینے کی پوری اور عجیب قابلیت رکھتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش کا سلسلۂ ضبط انگریزوں سے جوڑنے کا ذریعہ منشی رجب علی ہی تھا چنانچہ بہادر شاہ کی گرفتاری نیز شہزادوں کی اسیری اور قتل میں انہیں دو شخصوں کا حصہ سب سے بڑھا ہوا تھا۔

زہر گداز حقائق

مولوی سید رجب علی کے متعلق بعض دوسرے زہرہ گداز حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً

۱۔ ہڈسن مخبری بہم پہنچانے کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور یک چشم سید رجب علی صرف مخبری ہی نہیں کرتا تھا، بلکہ غنیم (مجاہدین آزادی) کی صفوں میں اختلاف کا بیج بھی بو رہا تھا۔

۲۔ حکیم احسن اللہ خان پر انگریزوں سے خط و کتابت کا شبہ تھا اور کیتھ ینگ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ شبہ بے بنیاد نہ تھا۔ جب حکیم کے مکان پر پہنچ کر تلاشی لی گئی تو ایک اشتباہ انگیز خط برآمد ہوا گو یہ کہتا ہے کہ یہ خط رجب علی نے عمداً حکیم کے مکان پر رکھوایا تھا تاکہ اس کے متعلق شبہ پیدا ہو۔ تھوڑی دیر کیلئے مان لیجئے کہ رجب علی نے انگریزوں کی ملازمت اختیار کر رکھی تھی۔ اور اس ملازمت کے بعض فرائض انجام دینے پر مجبور رہا۔ لیکن اس نے وہ طریقے اختیار کیے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔ مثلاً آزادی کے مجاہدوں میں تفرقے پیدا کرنا۔ اونچے درجے کے لوگوں کو اپنی خفیہ تدبیروں سے عوام کی نظروں میں مشتبہ بنانا اور اس طرح مطلب پر آدمی کا راستہ نکالنا یہ سب کچھ رجب علی نے کیا۔

جو اوائل اگست تک دہلی میں مقیم تھا۔ جب جاسوسوں کی سخت دیکھ بھال ہوئی تو وہ شہر سے نکل کر انگریزوں کے پاس پہنچ گیا۔ اسی نے بادشاہ اور شہزادوں کو گرفتار کرایا، اسی نے الٰہی بخش کے ذریعے سے زینت محل کو آمادہ کیا کہ وہ بادشاہ پر دباؤ ڈال کر حوالگی کے لیے راضی کرے۔ اس نے شہزادوں کو اس حالت میں گرفتار کرایا جب اسے معلوم ہو گیا کہ ہڈسن ان کے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔ یقیناً اس معاملے میں رجب علی اور الٰہی بخش کا جرم سب سے پہلے سامنے آتا ہے یہ بھی معلوم ہے کہ الٰہی بخش اور تمام دوسرے کارندے سب خبریں رجب علی ہی کے ذریعے سے انگریزوں کو بھجواتے تھے۔

بیگم زینت محل

انگریزوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ نے بھی گفت و شنید شروع کرنے کی تدبیر اختیار کی تھی، یعنی مٹکاف کو ایک خط بھیج کر اس کی صحت کے متعلق پوچھا تھا۔ شہزادوں کے پیغامات ملے تھے۔ ۲۱ اگست کو زینت محل کی طرف سے قاصد پہنچا تھا کہ وہ بادشاہ پر اثر ڈال کر کشمکش ختم کرانے کے لیے تیار ہے۔ ہوڈسن نے فارسی کی ایک تحریر ایک پرزے پر لکھی ہوئی کیتھ ینگ کے حوالے کی تھی۔ جس میں یہ فقرہ بھی تھا

"مرزا الٰہی بخش اور زینت محل بیگم کے پاس تحریر بھیج جائے تو اب بھی محصورین سے مطلوبہ امداد حاصل کی جا سکتی ہے۔"

اُس پر ۲۴ یا ۲۵ اگست کی تاریخ درج تھی، کہا جاتا ہے کہ مرزا الٰہی بخش نے بیگم کو عجیب و غریب اُمیدیں دلا رکھی تھیں۔ یعنی یہ کہ جواں بخت کی ولی عہدی کا اعلان ہو جائے گا، اور بادشاہ کی سابقہ حیثیت بحال کر دی جائے گی۔ یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جب حالات بگڑ گئے تو یہ کوشش شروع کی گئی کہ اب بچاؤ کی کوئی اور صورت پیدا کی جائے۔

بخت خاں کو جواب

بادشاہ ۱۹ ستمبر کی رات کو قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں گیا تھا۔ ۲۰ کو بخت خاں ملا۔ اس اثنا میں زینت محل اور مرزا الٰہی بخش بادشاہ کو سپاہ سے علیحدگی پر راضی کر چکے تھے میلسن نے لکھا ہے کہ مرزا الٰہی بخش بادشاہ کو رات کے وقت اپنے مکان پر لے گیا تھا اور وہیں نشیب و فراز سمجھا کر بخت خاں کی معیت میں روکا۔ ادھر منشی رجب علی کی طرف سے تاکیدی پیغام مرزا کے پاس آ گیا تھا کہ بخت خاں کے چلے جانے کے بعد صرف چوبیس گھنٹے کے لیے بادشاہ کو مقبرے میں روکے رکھیے۔ باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیجیے میں تمام انتظامات کر لوں گا۔

ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں کے مقبرے میں مرزا الٰہی بخش اور بخت خاں نے بیک وقت بادشاہ سے گفتگو کی۔ بخت خاں ساتھ جانے پر اصرار کر رہا تھا۔ اور مرزا روکتا تھا۔ یہاں تک کہ بخت خاں ایک موقع پر مرزا کو ختم کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن بادشاہ نے کہا، مجھے آپ کی رائے پسند ہے، تاہم جسم کی قوت جواب دے چکی ہے لہذا اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ جہاد جاری رکھیں تاکہ ہندوستان کی آبرو رہ جائے۔ کمال الدین حیدر نے لکھا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ کی طرف سے بخت خاں کو یہ بتایا تھا کہ وہ بھاگنے کے لیے تیار نہیں۔

فی الحقیقت بادشاہ کو یقین واثق تھا کہ ان کے (حکیم صاحب کے) واسطے سے معافی حکام سے حاصل ہو جائے گی۔ اور معیت فوج میں سراسر ذلت و خواری۔ یہاں کے ٹھہرنے سے بظاہر نان خشک مقصود ہے لیکن سفر رنگون کی خبر نہ تھی۔ بہر حال بیگم زینت محل کی کوتاہ نظری وسیلہ بنی، مرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی کی فریب آرائی سے بخت خاں کو جواب مل گیا۔ اسے بے حد قلق ہوا، لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ بہادر شاہ کی قسمت میں یہی تھا کہ تاریخ کے صفحات پر خون مظلومیت کا ایک دھبہ بن کر رہ جائے — اور یہی ہوا۔

میجر ہڈسن

مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ کو روک لیا اور منشی رجب علی کو خبر پہنچا دی۔ اس نے یہ خوشخبری ہڈسن کو سنا دی۔ جس کے ماتحت وہ مخبری و جاسوسی کے کام پر مامور تھا، ساتھ ہی بتا دیا کہ بادشاہ زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کی جاں بخشی کا حتمی فیصلہ کیے بغیر حوالگی کی منزل بہ خیر و عافیت طے نہ ہو گی۔ ہوڈسن انگریزی فوج کے سپہ سالار جنرل ولسن کے پاس پہنچا اور بادشاہ کو جاں بخشی کے وعدے پر گرفتار کرنے کی اجازت مانگی۔ ولسن اس وعدے کے لیے تیار نہ تھا۔ لیکن دوسرے افسروں کے مشورے کی بنا پر اس نے ہوڈسن کو اجازت دے دی اور وہ پچاس سوار لے کر ہمایوں کے مقبرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

گفت و شنید

ہڈسن وہ شخص تھا جو بادشاہ کی گرفتاری کے لیے مامور ہوا۔ یہ بڑا سنگ دل اور تند خو تھا، اور قتل و خونریزی کو کھیل سمجھتا تھا۔ مفروروں کو بے پروایانہ موت کے گھاٹ اتارنا اور مقتولوں کو لوٹنا اس کے لیے انتہائی مسرت انگیز شغل تھا۔ کمال الدین حیدر کے بیان کے مطابق منشی رجب علی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ بلکہ منشی ہی نے مقبرے میں جا کر پہلے بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کی، اور ہوڈسن کے آنے کی اطلاع دی۔ اس اثنا میں ہوڈسن مقبرے کے بیرونی دروازے کے قریب ایک خستہ حال عمارت میں ٹھہرا رہا۔ اگرچہ مرزا الٰہی بخش نے سب کچھ طے کر کے ہوڈسن کو اطلاع بھیجی تھی۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ اس اثنا میں پھر بادشاہ کی رائے بدل گئی۔ اُسے یقیناً رہ رہ کر خیال آتا ہو گا کہ انگریزوں سے اچھے سلوک کی اُمید نہیں رکھی جا سکتی۔ بلاشبہ بخت خاں کے ساتھ چلے جانے میں تکلیفوں اور مشقتوں کا بھی قوی اندیشہ تھا۔ مگر قید و پابندی کی اس زندگی سے جس کا تجربہ

تین پشتوں سے اس کے سامنے تھا۔ آزادی کی زندگی بہر حال بہتر تھی۔

چنانچہ پھر بحث شروع ہو گئی جس کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہا۔ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کا اصرار تھا کہ جاں بخشی کا وعدہ قبول کر کے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ بادشاہ پر تامل و تذبذب کی کیفیت طاری تھی۔ بڑی ردو کد کے بعد ہوڈسن کے پاس پیغام بھیجا گیا کہ جاں بخشی کا اقرار کرو تو حوالگی کے لیے قدم اٹھایا جائے۔ ہوڈسن نے بے تامل اقرار کر لیا۔ اس کے بعد مقبرے سے نکلنے کی تیاری ہوئی۔

حوالگی

چنانچہ سب سے آگے بیگم زینت محل کی پالکی تھی۔ اس کے بعد مرزا جواں بخت کی سواری تھی۔ سب سے آخر میں خود بادشاہ ہوادار پر سوار تھا۔

ہوڈسن یہ دیکھتے ہی پناہ گاہ سے نکل کر دروازے کے سامنے آ گیا اور شاہی ہوادار کے برابر پہنچ کر اس نے کہا کہ ہتھیار دے دیئے جائیں۔ بادشاہ نے پوچھا۔ تم ہوڈسن بہادر ہو؟ جواب اثبات میں ملا۔ تو کہا۔ میں تمہاری زبان سے بھی ایک مرتبہ اپنی نیز بیگم اور شہزادے کی جاں بخشی کا وعدہ سننا چاہتا ہوں۔ ہوڈسن نے وعدہ دہرایا اور بادشاہ نے ہتھیار اُس کے حوالے کر دیئے۔

ایک قلق افزا مسئلہ

ایک امر پر رہ رہ کر تعجب بھی ہوتا ہے اور قلق بھی کہ بادشاہ نے صرف بیگم اور شہزادہ جواں بخت کی جاں بخشی تک مطالبہ کیوں محدود رکھا؟ باقی بیٹوں، پوتوں اور خاندان کے دوسرے شہزادوں کو کیوں اس وعدے میں شامل نہ کیا؟ کیا زینت محل اپنے بیٹے کے سوا کسی کی جاں بخشی کی روادار نہ تھی۔ کیا مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ کو یہ سمجھا دیا تھا کہ اتنا وعدہ لے لیا جائے؟ باقی انتظام خود بخود ہو جائے گا؟ کیا باقی بیٹے بہادر شاہ کے لختِ جگر نہ تھے؟ کیا تمام شہزادوں کی رگوں میں وہی خون نہیں دوڑ رہا تھا؟ یہ معاملہ بخت خاں کی موجودگی میں ہی طے ہو جانا چاہیئے تھا۔ انگریز اسے قبول نہ کرتے تو بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ نکل جانا چاہیئے تھا۔ شہزادے لڑ کر جان دے دیتے تو ان کی موت بابر و تیمور کے گھرانے کا سرمایہ عزت و احترام ہوتی، جس بیچارگی کی حالت میں تیموریوں کا خون انگریز کے ہاتھ بہا اس میں عزت کا کون سا پہلو تھا؟ تیموریوں کی اصلی شان میدانِ جنگ کی موت تھی، نہ کہ بے دست و پائی کی حالت میں برسرِ راہ گولیاں کھانا یا پھانسیاں پانا یا قید خانے کی کوٹھڑیوں میں جانیں دینا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا حالات، کیا واقعات اور کیا اسباب تھے جن کی بنا پر دورِ آخر میں دورِ اوّل کی کوئی بھی خصوصیت پیدا نہ ہو سکی۔

اسیری کی پہلی منزل

ہمایوں کے مقبرے سے سواریاں سیدھی شہر کی جانب روانہ ہوئیں۔ کل چھیانوے (۹۶) افراد بادشاہ کے ساتھ تھے۔ جن میں سے زینت محل، تاج محل، جواں بخت، حکیم احسن اللہ خاں، مرزا قیصر شکوہ، میر فتح علی اور فوجدار کے نام قیصر التواریخ میں مذکور ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ بادشاہ کو دہلی دروازے سے شہر میں نہ لایا گیا جو ہمایوں کے مقبرے سے قریب ترین راستہ تھا، بلکہ لاہوری دروازے کا رخ کیا گیا جو مغربی سمت میں تھا۔ اور چاندنی چوک میں سے گزار کر اُسے لال قلعہ میں پہنچایا گیا۔ وہ لال قلعہ جس نے مغلوں کے دورِ عروج اور ہندوستان کے شان و شوکت کی بہار دیکھی تھی۔ اب اسی لال قلعے میں شاہ جہاں و عالمگیر کی میراث کا آخری حامل ایک بے بس اور بے کس قیدی کی حیثیت سے داخل ہو رہا تھا۔ وہاں اس پر انگریزی گارد کا پہرہ لگا دیا گیا۔ اور انگریز افسروں نے زبانِ طعن و تشنیع کھولی۔ یہ ظلم کے اس دور کی پہلی شام تھی جس میں بہادر شاہ کی حیاتِ مستعار کے باقی اوقات بسر ہونے والے تھے۔

جاں بخشی کا وعدہ

ہوڈسن نے ولسن کی اجازت سے جاں بخشی کا وعدہ کر لیا تھا۔ اس کے بغیر بادشاہ حوالگی کے لیے تیار نہ تھا۔ اگرچہ دہلی فتح ہو چکی تھی۔ لیکن بادشاہ پر قابو پانا سہل نہ تھا اور اگر وہ نکل جاتا تو انگریزوں کی مشکلات بڑھ جاتیں۔ تاہم خود ہوڈسن بادشاہ کو زندہ لانے کا خواہاں نہ تھا۔ اس نے خود چار روز کے بعد لکھا، میری آرزو یہ تھی کہ بادشاہ کو زندہ کی بجائے مردہ لاتا۔

ظہیر دہلوی کا بیان

ظہیر دہلوی نے داستانِ غدر میں بادشاہ کی آزادی کے آخری دنوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ وہ دید نہیں شنید پر مبنی ہے اور درست نہیں۔ مثلاً یہ۔

۱۔ فوج باغیہ نے میگزین اڑا دیا، پھر بادشاہ سے کہا کہ ہمارے ساتھ چلیے بادشاہ نے جواب دیا میں تمہارے ساتھ نہیں چلتا۔ میرا گھر برباد کرنا تھا کر چکے۔ جاؤ جہاں تمہارے سینگ سمائیں۔

۲۔ اس سے اگلے دن دہلی دروازہ کھلا اور سانڈرس نے آکر بادشاہ سے کہا۔ کہ آپ شہر میں تشریف لے چلیں۔ بادشاہ نے کہا مجھے شہر سے کیا مطلب؟ دادا کے مزار پر آپڑا ہوں، جو سلوک میرے ساتھ کرنا ہے یہیں پورا کر دو مولوی رجب علی نے کہا آپ ایسا خیال ہرگز نہ فرمائیں۔ تشریف لے چلیں۔ ناچار تن بہ تقدیر بادشاہ نے فرمایا۔ بسم اللہ!

شہزادوں کی مخبری

بادشاہ کی گرفتاری کے دوسرے دن منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش دونوں اپنے آقا میجر ہوڈسن کے پاس پہنچے اور اطلاع دی کہ بادشاہ کے دو بیٹے اور ایک پوتا بھی ہمایوں کے مقبرے میں یا اس پاس چھپے بیٹھے ہیں۔ اس اطلاع نے ہوڈسن کی وحشیانہ خصلتوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ چنانچہ اس نے سپہ سالار سے اجازت لی اور اپنے دستے کے کمانڈر لیفٹیننٹ میکڈول نیز ایک سو سواروں کے ہمراہ مقبرے پہنچ گیا۔ منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش بھی ساتھ تھے۔ ان کے بغیر شہزادوں کی گرفت ہو نہیں سکتی تھی۔

حوالگی کا مطالبہ

خود ہوڈسن کا بیان ہے۔

"میں نے اپنے تمام انتظامات کر لیے۔ مقبرے میں داخل ہونے یا باہر نکلنے کی تمام راہیں بند کر دیں اور اس کے بعد رجب علی کو یہ پیغام دے کر بھیجا۔ کہ میں شہزادوں کو سزا ہی کی غرض سے گرفتار کرنے آیا ہوں۔ اور اس کام کو پورا کرنے کا ارادہ کیے بیٹھا ہوں۔ دو گھنٹے کی ذہنی نزاع اور امید و بیم کی اضطراب انگیز حالت کے بعد شہزادے نمودار ہوئے اور پوچھا —— ہماری جان بخشی کا وعدہ کرتے ہو؟ میں نے جواب دیا قطعاً نہیں۔ اور انہیں پہرے کی حفاظت میں شہر کی جانب روانہ کر دیا" ——

ایک بیان کے مطابق شہزادوں نے رفیقوں سے صلاح کی تو انہوں نے کہا کہ تیموری خاندان کے لوگ مجبور ہو کر قید نہیں ہوا کرتے، تلوار اٹھاتے ہیں اور لڑتے ہیں۔ مرنا ہی ہے تو بہادروں کی طرح کیوں نہ مریں؟ افسوس کہ شہزادوں نے یہ مشورہ قبول نہ کیا۔

چند غور طلب اُمور

خواجہ حسن نظامی نے یہی لکھا ہے کہ مرزا الٰہی بخش کی نصیحتوں کے باعث شہزادے لڑنے کے خیال سے دست بردار ہو گئے۔ لیکن انہیں کیوں خیال نہ آیا کہ حوالگی یقینی موت ہے اور لڑائی میں بچ نکلنے کے امکانات موجود ہیں۔ مرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی نے کیوں ان بے چاروں کی جانیں معرضِ ہلاکت میں ڈالیں؟ اس لیے کہ خود ان مخبروں کی خدمات گراں قدر ہو جائیں۔ جن شہزادوں نے ان کا کچھ نہ بگاڑا تھا، ان کے خونِ ناحق سے خدمات کی دستاویزیں تیار کرنا کسی بھی انسان کے لیے باعثِ فخر و مباہات نہیں ہو سکتا تھا۔

شہادت گاہ کی طرف

غرض شہزادے سائبان والی بیل گاڑی میں مقبرے سے باہر نکلے۔ ایسی ہی گاڑیوں میں وہ ہتھیار بھرے ہوئے تھے جو ہوڈسن نے اس مجمع سے رکھوا لیے تھے۔ شہزادوں کی گاڑی کے دونوں طرف ہوڈسن نے پہرے لگوا دیے اور گاڑی والے کو لاہوری دروازے کی طرف چلنے کی ہدایت کر دی۔ لوگ اس گاڑی کے پیچھے بھی اسی طرح روانہ ہوئے۔ جس طرح ایک دن پہلے بادشاہ کی سواری کے پیچھے روانہ ہوئے تھے۔ ہوڈسن کے ایک سو سوار گاڑی اور مجمع کے بیچ میں تھے۔ کسی طرح کا رخنہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لوگوں کے حوصلے اتنے پست ہو چکے تھے۔ کہ وہ کوئی مخالفانہ قدم نہیں اُٹھا سکتے تھے۔

خونِ ناحق

شاید ہوڈسن کی آرزو تھی کہ مجمع کی طرف سے کوئی حرکت سرزد ہو۔ اور وہ اپنی دلی خواہش پوری کرے۔ آخر اس نے اپنے سواروں پر ہجوم کے دباؤ کو بہانہ بنایا۔ گھوڑا دوڑا کر بیل گاڑی کے پاس پہنچا۔ شہزادوں کو حکم دیا کہ گاڑی سے اُتر آئیں اور اوپر کا لباس اُتار دیں۔ پھر اپنے سواروں سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں گویا ہوا تا کہ ہجوم بھی سن لے۔

کہ یہ قیدی وہی قصاب ہیں۔ جنہوں نے انگریز عورتوں اور انگریز بچوں کو قتل کرایا۔ حکومت کا منشا یہ ہے کہ انہیں موت کی سزا دی جائے۔

یہ کہتے ہی اپنے ایک سوار سے قرابین لی اور تینوں بے دست و پا شہزادوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

خود سنگدل ہوڈسن کا بیان ہے کہ میں نے شہزادوں کو یکے بعد دیگرے گولی سے مارا۔ مجمع کے لبوں پر اللہ اکبر کی صدا جاری ہوئی اور دہشت زدہ مسلمان آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے۔

میں بے درد نہیں۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ ان بدبختوں کے وجود سے زمین کو پاک کر دینے کا موقع ہاتھ آنے پر مجھے خوشی حاصل ہوئی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ انہیں پھانسی پر لٹکواؤں گا۔ لیکن جب حالات نے یہ صورت اختیار کر لی کہ وہ رہیں گے یا ہم۔ تو میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

ایک بے سروپا افسانہ

آخری فقرے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہوڈسن شہزادوں کو شہر میں لانا اور مقدمے کے بغیر انہیں موت کی سزا دلوانا چاہتا تھا۔ لیکن ایک بڑا ہجوم شہزادوں کے اردگرد جمع ہو گیا اور اندیشہ تھا کہ ہوڈسن اور اس کے ایک سو سواروں پر حملہ کر کے شہزادوں کو چھین لیا جائے گا۔ بعض انگریز افسروں کو بھی بلوے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ حالانکہ یہ افسانہ بالکل بے سروپا تھا۔ ہوڈسن ایک روز پیشتر بادشاہ، بیگم اور شہزادہ جواں بخت کو گرفتار کر کے لے گیا تھا اور اس پر کوئی بلوہ نہیں ہوا تھا اور لوگوں کی عقیدت کا مرکز بادشاہ تھا نہ کہ شہزادے۔ پھر ہوڈسن خود ہجوم سے ہتھیار لے چکا تھا یہ عذر سراسر لغو ہے کہ شہزادے زندہ رہتے تو مجاہدین آزادی جن کی تعداد خاصی بڑی تھی۔ دوبارہ لڑائی کے لیے تیار ہو جاتے۔

ہیلی سن نے بالکل درست لکھا ہے کہ شہزادوں کا قتل غدر سے متعلق نہایت دردناک واقعات میں سے ایک واقعہ ہے۔

باسورتھ سمتھ کی صاف گوئی

لارنس کے سوانح نگار باسورتھ سمتھ نے اس بارے میں انتہائی صاف گوئی سے کام لیا ہے اور اس وجہ سے اصل فعل کی سنگینی کم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا مرتکب ایک انگریز تھا وہ لکھتا ہے۔

یہ سنگدلانہ قتل ایک احمقانہ اور بے دردانہ قتل تھا۔ شہزادے ہوڈسن کے ہاتھ میں بے دست و پا قیدی تھے۔ ہمارے ہم وطنوں کے قتل میں شرکت کے متعلق نہ کوئی قابلِ ذکر شہادت دی گئی تھی اور نہ دی جا سکتی تھی۔ اس کی شناخت اس غدار حرامی کی تنہا گواہی پر موقوف تھی۔ جو اپنے عزیز ترین دوست کی زندگی بھی قربان کر دینے پر تیار ہو جاتا۔ بشرطیکہ خود اُسے کوئی فائدہ پہنچ سکتا۔ اگر شہزادوں پر مقدمہ چلایا جاتا تو بڑے اہم اسرار کی پردہ کشائی ضرور ہوتی۔ ان کے لیے جرائم کے تناسب سزا دی جاتی اور مجروح قانون کے صابرانہ فیصلے کے ساتھ یہ سزا ضرور نافذ ہوتی۔

رابرٹس کا بیان

رابرٹس نے جو بعد ازاں فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس بنا۔ لکھا ہے کہ۔

قتل ضروری تھا یا نہ تھا۔ لیکن بلاشبہ اس سے ہوڈسن کی شہرت کا دامن داغدار ہوا۔ دہلی کی دیواروں کے اندر جو ظلم و ستم ہو چکے تھے ان کے سلسلے میں انتقام کی آگ اس وقت اس درجہ بھڑکی ہوئی تھی کہ فوج نے ہیجانِ جذبات کی بنا پر شہزادوں کے قتل کو منصفانہ فعل قرار دیا۔ ہوڈسن کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ بطور خود یہ کام کرتا یا بلا تحقیق و تفتیش اس کے کرنے کا حکم دیتا۔

شہزادوں کی نعشیں

قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ۔ شہزادے رتھ پر سوار تھے اور سواروں کے حلقے میں چلے آ رہے تھے۔ جیل خانے کے قریب پہنچے تو ہوڈسن نے سامنے بلوا کر، کپڑے اتروا کر پھر اسی رتھ پر سوار کیا اور اپنے ہاتھ سے تین تین گولیاں مقامِ قلب پر ماریں اور شہ رگ کو سنگین سے چیر دیا اور اس طرح چبوترہ کوتوالی میں جا کر نعشوں کو زمین پر ڈال دیا۔

خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ ہوڈسن نے تڑ تڑ تین فائر کیے۔ شہزادے "ہائے دھوکہ" کہہ کر زمین پر گر پڑے، خاک میں لوٹنے لگے اور کچھ دیر بعد جاں بحق ہو گئے۔

کمال الدین حیدر کہتے ہیں کہ لاشیں تین روز تک کوتوالی کے چبوترے پر پڑی رہیں اور پھر انہیں درگاہ خواجہ باقی باللہ میں دفن کرایا۔

مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں کہ کوتوالی میں چوبیس گھنٹے تک انہیں لٹکوائے رکھا حد درجہ دردناک بیان [illegible] کرتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی کو موت کے وقت تک انتقام کشی کا ہدف بنائے رکھنا وحشیوں کا شیوہ ہے۔ ہوڈسن اگر شہزادوں کو مار کر رک جاتا تو مہذب انگریز قوم کے جوشِ انتقام کی بہیمیت ہرگز آشکارا نہ ہو

تھی لہذا ان کی نعشیں کو توالی کے سامنے ڈال دی گئیں۔ جب گدھ کچھ مدت تک ان کا گوشت نوچ چکے تو سڑتے ہوئے جسدوں کو کھنچوا کر دریا میں ڈلوا دیا گیا۔

آہ! زمانے تیرے انقلابات! شہنشاہِ اکبر اعظم کی اولاد پر نمازِ جنازہ ادا کرنے اور انہیں آغوشِ زمین میں سلانے والا کوئی نہ تھا۔

بے گناہوں کا خون

مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں!

دلی کے آس پاس جتنے شہزادے ملے پکڑے گئے ان کی تعداد انتیس بیان کی جاتی ہے۔ ان میں بوڑھے لنگڑے بیمار سب کے سب پھانسی پر لٹکاتے گئے۔

شہزادہ مرزا قیصر کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس قدر بوڑھے تھے کہ ہوش و حواس بھی بجا نہ تھے۔ ان سے اُمید ہی نہ ہو سکتی تھی کہ غدر میں کوئی حصہ لیا ہوگا۔ لیکن انگریز اندھے ہو رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمردیوں کا زیادہ سے زیادہ خونِ ناحق بہا کر بھی ان کی پیاس نہیں بجھے گی۔ شہزادہ محمود شاہ وجع المفاصل کے باعث اُٹھ بیٹھ ہی نہ سکتا تھا۔ اس بیچارے نے کسی کارروائی میں کیا حصہ لیا ہوگا۔ تاہم اس کے گلے میں بھی پھانسی کا پھندا ڈالے بغیر تسلی نہ ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ سر جان لارنس نے سفارش کی تھی۔ شہزادوں کے معاملات کی تحقیقات واجبی کی جائے۔ لیکن اس سفارش پر کسی نے توجہ نہ کی۔

مرزا غالب لکھتے ہیں۔۔۔

> شہزادوں کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ چند کو اژدہائے موت کھولکے دہانِ زخم میں نگل گئے۔ چند پھانسیوں پر کھنچے اور جان ان کے بدن میں افسردہ ہوئی۔ چند قید میں ہیں۔ اس خاندان کے چند آوارہ در گرداں پھرتے ہیں۔ بادشاہ جو قلعے میں رہتا تھا ناب و تواں کا ماتمی ہے۔ اور اس پر مقدمے کا دار و گیر جاری ہے۔

اسیر شہزادے

جن شہزادوں کو قید کی سزا دی گئی۔ ان سے عام دستور کے مطابق مشقت لی جاتی تھی وہ بیچارے مشقت کیا کر سکتے تھے۔ ان سے چکی پسوائی جاتی ہیں نہ سکتے تو کوڑوں کی مار پڑتی۔ یہاں تک کہ وہ بیچارے چند روز میں مرجاتے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس طرح کتنے مرتے۔ ان کا قصور اس کے سوا کیا تھا کہ بہادر شاہ کے خاندان سے تھے۔

سید ظہیر دہلوی نے لکھا ہے۔ کہ مرزا الٰہی بخش کی نشان دہی سے تین شہزادگان دہلی کو جن میں بادشاہ کے پوتے، نواسے، داماد تھے، بیرون دہلی دروازہ قتل کیا گیا اور ان کے سر کٹوا کر بادشاہ کے پاس بھجوا دیئے گئے یہ بھی محض شنید ہے جو صحیح نہیں۔ اگرچہ مولانا فضل حق نے بھی لکھا ہے۔

دہلی میں لوٹ مار کی قیامت

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

قوت بیان کی بے بسی

یوں تو جنگِ آزادی کے ایک دو نہیں بیسیوں پہلو ایسے ہیں جن کا تصور آتے ہی قوتِ بیان پر انتہائی بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن فتح دہلی کے بعد شہر پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً جو قیامت گزری۔ اس کی سرسری کیفیت بھی پیش کرنا کم از کم استناد درد انگیز اور زہرہ گداز ضرور ہے۔۔۔ جیسا کہ دل کو پہلو سے نکال کر دہکتے ہوئے انگاروں پر ڈال دیا جائے۔ اگر کسی شخص میں اتنی ہمت ہو۔ کہ قلم کا کام برقِ تپاں سے لے سکے۔ اور سیاہی کی جگہ خونِ جگر استعمال کرے تو ممکن ہے وہ اس آتش کدۂ ظلم و تعدی کی دھندلی سی تصویر تیار کرے جو ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء سے دہلی میں انگریزوں نے بھڑکایا، اور جہنوں تک شہر کا سرمایہ جان و مال و آبرو خس و خاشاک کی طرح جل کر خاکستر بنتا رہا۔ شہر دہلی نے صدیوں تک یگانہ جاہ و جلال کی بہاریں بھی دیکھیں۔ اور آتش و خون کے طوفانوں میں بھی غوطے کھائے۔ نادر و تیمور کی خونریزیوں سے متعلق عام کیا ہے! یہ کہ ان بیدرد فاتحوں نے جور و جور و وحشت کی یادگار تھے۔ نمائشِ اقتدار کے جنون میں انسانی خون کے دریا تاریخ کے صفحات پر بہا دیئے۔ لیکن انگریزوں نے فتح کے بعد جو کچھ کیا۔ اس کے بے تیمور و نادر کی مثالیں پیش کرنا بالکل لاحاصل و بے سود ہوگا۔ اس لیے کہ نہ دنیا خونچکاں مرقع دہلی کے آسمان نے پہلے کبھی دیکھا تھا۔ اور نہ اس کے بعد نظر آیا۔ اگر خاک دہلی کے ذروں کو قدرت تھوڑی دیر کے لیے قوتِ گویائی عطا کردے۔ تو شاید یہ داستانِ درد سنائی جا سکے۔ ہم یہ داستان زیادہ تر انگریزوں ہی کی زبان سے پیش کرتے ہیں تاکہ اس کی صحت میں کسی کو شبہ نہ ہو۔

عام کیفیت

۱۴ ستمبر کو انگریزی فوج کا عمل دخل کشمیری دروازے کی طرف شروع ہوا۔ تو مجاہدین آزادی شہر سے نکل کر اجمیری دروازے سے دہلی دروازے تک پھیل گئے۔ ان کا خیال تھا کہ شہر کے اندر لڑنے کی بجائے باہر نکل کر لڑے۔ کشمیری دروازے اور کابلی دروازے کی آبادی بھی اجمیری دروازے، ترکمان دروازے، دہلی دروازے اور فراش خانے کی کھڑکی طرف سمٹ آئی۔

انگریزی فوج نے شہر کے مزید حصے پر قبضہ کر لیا۔ تو لوگ باہر بھاگنے لگے اور شاہجہان آباد کی جنوبی سمت میں قطب صاحب تک پناہ گیروں ہی کے قافلے نظر آتے تھے۔ اس حالت میں مجاہدین آزادی کے لیے رزم و پیکار جاری رکھنے اور مقابلہ کرنے کی کیا صورت تھی؟

پھر ایک مصیبت یہ آئی کہ آس پاس کے گوجروں اور میواتیوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ دہلی والے بھرے گھر چھوڑ کر بھاگے تھے اس لیے انگریز قتلِ عام کر رہے تھے۔

مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں۔

> سپاہ شہر کشا نے شہر میں قدم رکھا۔ تو اس کے سامنے جو مرد آیا۔ اس کو وہ گولی مارتے۔ اس وقت دوست دشمن مجرم و غیر مجرم میں تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ اس میں کچھ ہندوستان کی تخصیص نہ تھی۔

ایسی حالت میں لوگ ساتھ کیا لے جا سکتے تھے؟ تاہم جو کچھ بھی انہوں نے لیا تھا گوجروں اور میواتیوں نے چھیننا شروع کر دیا۔ بدن کے کپڑوں کے سوا شاید ہی کسی کے پاس کچھ رہا ہو۔

کوئی کسی کھنڈر میں جا بیٹھا۔ کسی نے گڑھے میں ڈیرا جمالیا۔ قطب صاحب اور سلطان جی کے خادم ہمیشہ اہل شہر کی خیرات سے پرورش پاتے تھے۔ وہ تمام حقوقِ انسانی کو پس پشت ڈال کر ایک ایک مکان اور مقبرے کا دس دس بیس بیس گنا مانگنے لگے۔ اہلِ شہر نے مصیبت کی حالت میں امانتیں ان خادموں کے پاس رکھ دی تھیں۔ بعض خادموں نے ان میں بھی خیانت کی۔

مستورات کی بدحالی

جن عورتوں نے کبھی گھر سے باہر نہ قدم رکھا تھا۔ انہیں پیادہ پا چلنا پڑا۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ جو نامحرموں کی نگاہ کے سامنے آنے کو موت سے بدتر سمجھتی تھیں۔ بے پردہ صحرا نوردی کر رہی تھیں۔ غرض جو مصیبت ان پر پڑی تھی۔ جب سے دہلی آباد ہوئی تھی کبھی نہ پڑی تھی۔ ہزاروں موت کی نذر ہو گئیں جیسے کہ وبا پھوٹ پڑی۔ ایسی خواتین بھی تھیں، جنہوں نے دربدر خاک بسر پھر کر جینے کی بجائے مر جانا بہتر سمجھا۔ وہ کنوؤں میں کود پڑیں اور ڈوب گئیں۔

> کنوؤں میں عورتیں اتنی گریں۔ کہ پانی میں ڈوبنے کی جگہ نہ رہی پھر جو ان پر اور عورتیں گریں وہ زندہ رہیں۔ چند سال بعد شہر کے کنوئیں صاف ہوئے تو بہت سے کنوؤں سے عورتوں کی لاشیں نکلیں۔

عینی شہادت

۱۹ ستمبر کو لال قلعہ انگریزوں کے قبضہ میں آیا تھا۔ دابرش ۲۴ء، کی صبح کو اس فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ جو دہلی سے کانپور بھیجی گئی تھی وہ لکھتا ہے۔

> صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا۔ لال قلعے کے لاہوری دروازے سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گزرے۔ دہلی حقیقتہً شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کے سموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری۔ ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں، ہر نعش پر وہ حالت طاری تھی۔ جو موت کی کش مکش نے طاری کر دی تھی۔ ہر نعش تجزیہ و تحلیل کے مختلف مراحل میں تھی۔ ہم چپ چاپ چلے جا رہے تھے یا سہم سہمے کر بے ارادہ زیر لب باتیں کر رہے تھے۔ تاکہ انسانیت کے ان دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑے۔ جن مناظر سے ہماری آنکھیں دوچار ہوئیں وہ بڑے ہی خوفناک اور انتہا درجہ رنج افزا تھے۔ کہیں کوئی کتا کسی نعش کا بچا کھچا عضو بھنبھوڑ کر کھا رہا تھا، کہیں کوئی گدھ ہمارے قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑپھڑاتے پروں سے ذرا دور چلا جاتا تھا۔ لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اڑ نہ سکتا تھا۔ اکثر حالتوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے رہتے جیسے کسی کو اشارہ کر رہا ہو۔ دراصل یہ پورا منظر اس درجہ ہیبت ناک اور دہشت انگیز تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے۔ ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا۔ اس لیے کہ وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے پوری فضا ناقابل تصور حد تک مہلک تھی جو بڑی متعفن اور مرض اور بدبو سے لبریز تھی۔

یہ بیان کسی تشریح کا محتاج نہیں اور صاف ظاہر ہے کہ دہلی پر قابض ہونے کے بعد پانچ روز تک مردوں کے دفن کا کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ اگرچہ اس اثنا میں لوٹ اور مال اسباب کی فراہمی پوری سرگرمی سے جاری رہی۔

فوجی گورنر

کرنل برن شہر کا فوجی گورنر مقرر ہوا۔ جس نے قطب الدین کی کوٹھی میں اپنا مرکز بنایا۔ یہ کوٹھی چاندنی چوک میں تھی شہر میں تھوڑی سی آبادی رہ گئی تھی۔ لنگریوں کے جیش مقرر ہو گئے جو بازاروں گلیوں کے چکر لگاتے۔ جہاں کسی گھر کو آباد پاتے۔ مردوں، عورتوں، بچوں سب کو پکڑ کر برن کے پاس لے آتے۔ اوڑھنے بچھونے کے پشتارے مردوں کے سروں پر ہوتے "تلاش" میں جو قیمتی چیز ہوتی نکال لی جاتی اور جس اسباب کو چند کوڑیوں میں بھی کوئی نہ خریدتا۔ اسے واپس دے کر لاہوری دروازے سے باہر نکال دیتے کہ جہاں سینگ سمائیں چلے جائیں۔ اس طرح باقی شہر بھی خالی کرا لیا گیا۔ صرف گنتی کے گھر آباد تھے۔

لوٹ

فتح کے ساتھ ہی فوج کو تین روز کے لیے لوٹ کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس ورتھ نے لکھا ہے کہ اگر اجازت نہ دی جاتی تو سپاہ اس حالت میں بھی باز نہ رہتی۔ سکھوں اور دوسرے لوگوں کو معلوم تھا کہ دہلی میں اعلیٰ قیمتی سامان، جواہرات، سونے چاندی کے برتنوں اور روپے کے انبار لگے ہوئے ہیں، شہر خالی پڑا تھا۔ بیلوں کے سوا کوئی وہاں موجود نہ تھا۔ پوری آبادی گردونواح کے دیہات میں بے بس پڑی تباہ ہو رہی تھی۔ اس منظر کا تصور آج بھی کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ یہ پتھر جیسے دل بھی ہلا دیتا لیکن فاتح انگریزوں کے دل اس سے بالکل غیر متاثر تھے۔

ہوڈسن کے کارنامے

باس ورتھ سمتھ کا بیان ہے کہ ہوڈسن اور اس کے ساتھی لوٹ میں پیش پیش تھے۔

> ہوڈسن کے کیمپ میں مختلف جانور اور گاڑیاں موجود تھیں ظاہر ہے کہ یہ اس کی منظوری کے بغیر نہ آئی ہوں گی۔ ہوڈسن خود قیمتی سامان سنبھال لینے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا، لکھنؤ میں اس کی موت کے بعد جن لوگوں کو اس کا سامان کھولنے کا دردناک فرض انجام دینا پڑا، انہیں شہر دہلی کی لوٹ کے نمونے بھی ملے۔

ایک انگریز خاتون کا بیان

مسز مٹر (کرنل مٹر کی بیوی) سب سے پہلی انگریز خاتون تھی جو تسخیر دہلی کے بعد میرٹھ سے پہنچی تھی۔ وہ لکھتی ہے کہ میرے شوہر کے سپرد یہی کام تھا۔ وہ ناشتے کے بعد قلیوں کی جمعیت لے کر نکل جاتا۔ جس عمارت میں دفینہ کی رپورٹ پہنچتی۔ اسے دن بھر کھدائی کے لیے مقرر کر لیا جاتا۔ چھت اور صحن کی پیمائش احتیاط سے کر لینے کے بعد معلوم ہو جاتا کہ مال کہاں دبا ہوا ہے۔ ایک روز میں نے بعض احباب کو دوپہر کے کھانے پر بلایا کرنل مٹر کے آنے میں دیر ہوئی ایک مہمان نے بتایا کہ وہ تو نہ آ سکیں گے ایک مکان میں بڑا خزانہ ہاتھ لگا ہے۔

> بڑی دیر کے بعد میرا شوہر واپس آیا۔ اس کے ساتھ تیرہ گاڑیاں مال غنیمت سے بھری ہوئی تھیں دوسری قیمتی چیزوں کے علاوہ اسی ہزار روپے نقد بھی تھے۔

ایک دوسرے موقعے پر ایک مکان سے چاندی کے برتن اور سونے کے زیور نکلے۔ چلتے چلتے ایک قلی سے کہا گیا کہ ذرا صحن میں بھی دو چار کدال چلا دو۔ چنانچہ پہلی ہی ضرب میں ایک ہزار کی تھیلی مل گئی۔ مزید کھودا گیا تو معلوم ہوا کہ اور تھیلیاں برابر رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن تھیلیوں کا کپڑا بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اور رات اندھیری تھی۔ لہذا کھدائی کا کام صبح پر ملتوی کرنا پڑا۔

بعض مقامات پر دفینوں کی اطلاع ملی۔ لیکن موقع پر پہنچنے سے پہلے ہی بدمعاش نکال کر لے گئے تھے قلعے میں دیوان خاص کے باہر زیورات اور جواہرات اور دوسرا قیمتی سامان ایک شامیانہ لگا کر سجا دیا گیا تھا۔ تاکہ جو چاہے خریدے۔

ہمہ گیر تباہی

شہر انسانوں سے خالی ہوا۔ مال و دولت اور اسباب میں کچھ نہ باقی چھوڑا گیا۔ جو چیزیں اٹھائی نہ جا سکیں وہ توڑ دی گئیں۔ لیکن اس پر انگریزوں کا دل ٹھنڈا نہ ہوا۔

۱۔ مکانوں کے دروازے توڑ کر جلائے جاتے۔ ان میں سے چیل لوہا نکال کر بیچا جاتا۔

۲۔ مندروں اور مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی۔ کسی بت کی ناک کاٹی گئی۔ کسی کے کان کترے گئے۔

۳۔ جامع مسجد سکھوں کی بارک بنی۔ زینت المساجد گوروں کا مسکن تھی۔ نواب حامد علی خان کی مسجد جو شیعوں کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ گدھے بندھے۔

۴۔ جو گھوڑے شہر میں رہ گئے تھے وہ سپاہیوں کی رانوں تلے روندنے لگے۔ بیل، ٹٹو، بھینسے، گدھے بوجھ اٹھانے کے کام میں لائے گئے۔ گائیں بھینسیں، بکریاں سپاہیوں نے بانٹ لیں۔ مرغیاں، تیتر، بٹیر اور دوسرے خوب صورت پالتو پرندے بھون بھون کر کھائے گئے۔

کیا انتقام کی ایسی انسانیت سوز مثال بھی کہیں ملتی ہے؟

بے دردانہ قتل

جس گلی کوچے میں کسی مسلمان کو وجیہہ اور تنومند دیکھتے اپنا شکار بنا کے دل کو ٹھنڈا کرتے۔ ان کے ہاتھوں سے بہت سے معزز اور خاندانی مسلمان جو بدقسمتی سے شہر میں رہ گئے تھے مارے گئے۔ وہ بوڑھے باپوں کے سامنے جوان بیٹوں کو مار ڈالتے اور باپ کو کہہ دیتے چلا جا۔ غرض حسین و وجیہہ مسلمانوں کو اتنا انہوں نے مارا کہ دلی میں خوش صورت مسلمانوں کا پیدا ہونا ہی بہت کم ہو گیا۔ اگر دلی کے پہلے اور اب کے مسلمانوں کی صورتیں ملا کر دیکھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ غدر نے ان کی وجاہت و صورت کو بہت کم کر دیا ہے۔

لارنس کا مکتوب

جان لارنس نے ماہ دسمبر ۱۸۵۷ء میں جب تسخیر دہلی پر دو مہینے سے زیادہ مدت گزر چکی تھی انگریزی فوج کے کمانڈر کو لکھا۔

> مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریقے پر بلا امتیاز تمام طبقوں کو لوٹا ہے۔ اس کے لیے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی۔ اور یہ فعل بالکل حق بجانب ہوگا۔ بہر حال دو مہینے کی لوٹ کو کافی سمجھنا چاہیے۔ میرے پاس اس بارے میں بمبئی سے بھی خبریں پہنچ رہی ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا ہے۔ اگرچہ یقین نہیں آتا ہے کہ اکثر باہر نکل نکل کر دیسی باشندوں کو بے دردی سے قتل کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے سامنے بلند اصول نہ بھی ہوں جب بھی عام مصلحتوں کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہم وطنوں کو اس قسم کی چیرہ دستیوں سے باز رکھے۔ باغیوں اور قاتلوں کو پھانسی پر لٹکانے یا گولی سے اڑا دینے کے لیے مجھ سے زیادہ مستعد کوئی نہ ہوگا لیکن ہمیں دوست دشمن میں تمیز کرنا چاہیے موجودہ صورت حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام طبقے ہمارے خلاف متحد ہو جائیں گے اور چھاپادلی جنگ شروع ہو جائے گی۔ ملک آہستہ آہستہ ویرانی کی منزل پر پہنچ جائے گا۔ اور پھر ہمارے لیے یہاں ٹھہرنا ہی ممکن نہ رہے گا—

پھانسیوں اور گولیوں کا طوفان

اتنا کچھ کرنے کے باوجود انگریزوں کے جوشِ انتقام کی تسکین نہ ہوئی اور خونریزی کی پیاس نہ بجھی۔ کوتوالی اور ترپولیے کے درمیان چاندنی چوک میں جو حوض تھا۔ اس کے تین طرف پھانسیاں پانے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ ایک گروہ کو پھانسیوں پر چڑھا دیا جاتا۔ باقی لوگ کھڑے ہوئے دیکھتے رہتے کہ ان کے خاتمے کے بعد ہماری باری آئے گی۔ اور یہ مقام انگریزوں کی خاص سیرگاہ بن گیا تھا۔ پاس کے ایک موقع شناس دکاندار نے اپنی دکان کے سامنے کرسیاں رکھ دیں کہ انگریز بیٹھیں گے تو خوش بھی ہو جائیں گے اور کچھ دے بھی جائیں گے۔ چنانچہ انگریز افسر آتے، کرسیوں پر بیٹھتے، سگریٹ سلگاتے۔ پھانسی پر چڑھنے والوں کی جان کنی کا تماشا دیکھتے اور چند پیسے دکاندار کو دے جاتے۔ مظلوم بے دم ہو جاتے تو ان کی نعشیں ایک بیل گاڑی میں ایک دوسرے کے اوپر ڈال دی جاتیں تاکہ نئے مظلوموں کے گلے میں پھندا ڈالا جا سکے۔

ایک فوجی کمیشن بنا دیا گیا تھا لیکن اسے نہ کسی ملزم کے متعلق چھان بین سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ یہ خیال تھا کہ جن کے خلاف جرم ثابت ہو جائے انہی کو سزا دی جائے۔

محاصرہ دہلی (انگریزی) کا مصنف لکھتا ہے۔

> ملزموں کو گرفتار کر کے مقدمات کی چھان بین کے لیے فوجی کمیشن کے روبرو پیش کر دیا جاتا تھا، یہ کام بڑی تیزی سے ہوتا تھا۔ موت کے سوا کوئی سزا نہ تھی۔ اور اثبات جرم کے سوا کسی مقدمے کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ جن اصحاب کا کام ملزموں کے جرم کی چھان بین تھا وہ نرمی کے چنداں روادار نہ تھے۔
>
> خود باس ورتھ سمتھ نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر دس بارہ ملزم کمیشن کے روبرو پیش کیے گئے ان کے خلاف ارتکاب جرم کی کوئی شہادت نہ تھی کمیشن نے فرمایا کہ بظاہر یہ سپاہی معلوم ہوتے ہیں یا سمجھنا چاہیے کہ انہوں نے کسی وقت ہتھیار اٹھائے ہوں گے۔ بس اسے کافی سمجھ لیا گیا اور تھوڑی کے بعد وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکائے گئے۔

نیا کمیشن

یہ سلسلہ قتل عام اواخر ستمبر ۱۸۵۷ء سے اواخر فروری ۱۸۵۸ء تک جاری رہا۔ ۲۴ فروری ۱۸۵۸ء کو جان لارنس دہلی پہنچا تو اس نے وائسرائے کو تار دیا کہ ہر شخص کو موت و حیات کا جو اختیار دے دیا گیا ہے اسے فوراً واپس لے لیا جائے۔ اس لیے کہ بعض نے اس اختیار کا ناجائز استعمال خوفناک طریقے پر کیا ہے۔ اور اس کی جگہ سول اور فوجی حکام کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔ جو مقدمات سنے اور حکومت کی منظوری کے بغیر کسی کو موت کی سزا نہ دی جائے۔ یہ ہو گیا لیکن جونہی لارنس دہلی سے باہر گیا فوجیوں نے پھر وہی حرکتیں شروع کر دیں۔

ایک گوجر کو موت کی سزا سنائی گئی اور اسے منظوری لیے بغیر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ بعض فوجی افسر ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے کہ ابھی دہلی میں کمپنی کی حکومت بدستور جاری ہے۔

پھانسی پانے والوں کے اصناف

مولوی ذکاء اللہ نے پھانسی پانے والوں کے اصناف کی تفصیل یہ بتائی ہے۔

۱۔ خاص برادران شاہی جو قلعے میں تھے اور ان پر انگریز عورتوں اور بچوں کے

خون کا الزام تھا۔ ان میں سے ایک بھی پھانسی سے نہ بچا۔

۲۔ میگزین کے ملازم جنہوں نے ہنگامہ شروع ہونے کے دن میگزین کے انگریز کافکٹوں پر یورش کی تھی۔ اور ا نہیں میگزین کو آگ دینے کی ضرورت پیش آئی کریم بخش ان کا سردار تھا۔ ان میں سے صرف وہی بچ سکے۔ جو بھاگ گئے اور ہاتھ نہ آسکے۔

۳۔ وہ سپاہی جو اس درجہ زخمی ہو چکے تھے کہ بھاگ نہ سکے۔ یہ زیادہ تر مسجدوں میں پڑے ہوئے ملے

۴۔ وہ مجاہدین جو شہر کے اندر یا باہر آس پاس چھپ گئے رہتے اور وہ پکڑے گئے۔

۵۔ اجمیری دروازے کے موچی۔ ان پر یہ الزام تھا کہ جیتو فلس مشکاف آغاز ہنگامہ پر سوار ہو کر بھاگا تھا۔ تو اجمیری دروازے کے راستے گیا تھا اور موچی بانس نکال نکال کر اُسے مارنے دوڑے تھے۔

۶۔ میواتی اور گوجر۔ جنہوں نے بڑی لُوٹ مچائی تھی۔

آخری گروہ کا قصور بظاہر یہ نہ ہو سکتا تھا کہ انہوں نے احترام مال کے ضابطے کو پس پشت ڈالا۔ اس لیے کہ یہ ضابطہ فاتح انگریزوں نے دہلی میں انہیں ملک قائم ہی نہ ہونے دیا تھا۔ قصور یہی ہو سکتا تھا کہ جو مال گوروں یا سکھوں کو ملنا چاہیے تھا وہ میواتی یا گوجر لے گئے۔

کوچہ چیلاں میں قیامت

اس کوچے میں کسی شخص نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو دوران ہنگامہ انگریزوں کے لیے وجہ شکایت بنتی۔ اتفاق سے وہاں انگریزی لشکر کا کوئی سپاہی زخمی ہو گیا۔ اس باب میں روایتیں مختلف ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی سپاہی کسی زنانے میں گھسنا چاہتا تھا۔ حکیم فتح اللہ یا محمد علی خان (ابن خیر جنگ خان) نے اُسے روکا اور کشمکش میں وہ زخمی ہو گیا۔ اس پر ...

حاکموں نے حکم دیا کہ اس کوچے کے تمام مردوں کو مار ڈالو یا پکڑ کے لے آؤ۔ بہت سے مردوں کو تو سپاہیوں نے ان کے گھروں میں مار ڈالا۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں کوئی مردہ نہ مارا گیا ہو۔ کچھ آدمی زندہ بھی گرفتار ہوئے۔ جن کو حکم ہوا کہ جمنا کی ریتی میں قلعے کے نیچے گولی سے مار دیئے جائیں۔ سپاہی ان کو ریتی میں لے گئے۔ ان پر سپاہیوں نے صرف گولیوں کی ایک باڑ ماری ان میں سے دو آدمی مرزا المصطفیٰ بیگ اور وزیر الدین زندہ بچے۔

یہ دونوں بیان کرتے ہیں کہ بہت سے لوگ گولیاں لگتے ہی سرد ہو گئے۔ بعض دریا کی طرف بھاگے۔ آگ سے بچے مگر پانی میں ڈوب گئے۔ جانتے ہو ان مقتولوں میں کیسے کیسے افراد تھے؟ سید احمد میاں امیر پنجہ کش جو خوش نویسی میں اپنے وقت کا یگانہ جلیل القدر فرد تھا اور نوّے سال کی عمر تھی۔ مولوی امام بخش صہبائی جو دہلی کے مشہور عالم اور معلم تھے۔ ان کے دو بیٹے اور کنبے کے کل اکیس فرد ان مظلوموں میں شامل تھے۔ صرف ان کا ایک بھانجا بچا جو ان کا داماد بھی تھا یعنی وزیر الدین۔

دوسرا بیان

یہ مولوی ذکاء اللہ کا بیان تھا۔ مولانا راشد الخیری نے صہبائی کے بھانجے کا نام قادر علی بتایا ہے۔ جو صہبائی کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ دلی محشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ میں صبح کی نماز اپنے ماموں (صہبائی) کے ساتھ کٹرہ مہرپرور کی مسجد میں ادا کر رہا تھا۔ پہلی ہی رکعت تھی۔ امام کے ملانے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں اور گرفتار کر کے دریا کے کنارے پر لے گئے۔ فتح دہلی پر ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے کہا کہ موت تمہارے سامنے ہے۔ دریا تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں سے جو تیرنا جانتے ہیں۔ وہ دریا میں کود پڑیں۔ ماموں اور صاحب زادے سو تیرنا نہیں جانتے تھے دل نے گوارا نہ کیا کہ انہیں چھوڑ کر جان بچاؤں۔ لیکن ماموں کے اشارے سے کود پڑا۔ کوئی پچاس ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آواز میرے کان میں آئی اور صف بستہ لوگ گر گئے۔

غرض قادر علی بڑی تکلیفیں اُٹھا کر جودھ پور پہنچا اور فوج میں صوبیدار ہو گیا پنشن لے کر دہلی آیا۔ یہ انگریزوں کا انصاف تھا جس کے آوازے سے نوّے برس تک اس ملک کی فضا گونجتی رہی۔ مفتی صدر الدین آزردہ نے کس درد سے کہا ہو گا۔

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

نعشوں کے متعلق دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ دریا میں بہا دی گئیں اور جمنا کے کنارے لے جا کر قتل کرنے کا مقصد یہی تھا۔ کہ نعشوں کو دفن کرنے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ ایک روایت یہ ہے کہ دریا کے کنارے ہی گڑھے کھود کر نعشیں ان میں پھینکیں اور اوپر سے مٹی ڈال دی۔

ہر طرف موت

کچھ لوگ یہ سمجھ کر الور چلے گئے تھے کہ وہاں دہلی کے آدمیوں کو عزت و اقتدار حاصل ہے اور ان کی وساطت سے بے جرمی کا ثبوت مہیا کرنے میں آسانی ہو گی۔ لیکن غلام فخر الدین مجز وہاں بھی عزرائیل بن کر پہنچ گئے اور ایک ایک کو چن چن کر گرفتار کرا دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو گوڑگانوں کے مجسٹریٹ نے درختوں سے بندھوا کر پھانسی دے دی۔ جنہیں دہلی لائے انہیں یہاں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

جن لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ ان میں سے بعض جوانوں کی مائیں بھی جگر کے ٹکڑوں سے آخری ملاقات کے لیے آ گئیں۔ اس وقت حشر کا جو منظر نمودار ہوا ہو گا وہ بیان میں نہیں آ سکتا۔ اکثر نے زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر ٹوپی اور ذہن پیلے بندھے ہوئے تھے۔ پیروں میں ٹاٹ بانی کی زری کے کام والی جوتیاں تھیں اور چست انگرکھے۔ مائیں چیخ رہی تھیں اور بیٹے دم بخود تھے۔ انگریزوں کو یہ نظارہ بھی متاثر نہ کر سکا۔

ان مظلوموں میں محمد حسین خان، مرزا احمد خان، میر محمد حسین، نو شیر خان، خلیفہ اسماعیل (فرزند ذوق مرحوم) اور رسالدار صفدر جنگ جیسے اصحاب بھی شامل تھے

ظلم کی حد ہو گئی

کہا جاتا ہے کہ فتح دہلی کے وقت تمام انگریز اپنے مظلوم ہم قوموں کے قتل کی وجہ سے پاگل ہو رہے تھے حالانکہ یہ قتل عام اور کھلے بندوں غارت گری کے لیے کوئی عذر نہیں بن سکتا لیکن انگریزوں کی حالت تو غدر سے سالہا سال بعد تک بھی یہی رہی۔ مثلاً

۱۔ مرزا مغل بیگ ایک شاہی ملازم تھا۔ اس پر جنوری ۱۸۶۲ء میں مقدمہ چلایا گیا کہ وہ اس گروہ میں شریک تھا۔ جس نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو چند انگریز مارے تھے۔ مختلف گواہ پیش کیے گئے۔ جن کی گواہیوں کے بیانات میں خاصا اختلاف تھا اور وہ جعلی معلوم ہوتے تھے۔ پنجاب کے جوڈیشنل کمشنر نے گواہوں کے بیانات میں اختلاف کے باوجود مرزا مغل بیگ کو پھانسی کی سزا سنا دی اور اس غریب کو پھانسی دی گئی۔

۲۔ حاجی مہسرکن پر بھی یہی الزام تھا۔ وہ بے چارہ پہلے دارو گیر کے خوف سے بستی نظام الدین میں رہا۔ مخبروں نے اُسے پکڑوا دیا۔ مٹکاف نے دیکھتے ہی اسے تلوار

ماری اور مُردہ چھوڑ کر چل دیا۔ دستہ دار اُسے اٹھالے گئے۔ چار مہینے علاج کرایا اور وہ اچھا ہوگیا۔ چپ چاپ لاہور آگیا۔ اور یہاں نام بدل کر کاروبار کرتا رہا۔ ۱۸۶۸ء میں گرفتار ہوا۔ اُسے بھی کسی واضح ثبوت کے بغیر پھانسی دے دی گئی۔

کیننگ کی بدبختی

۱۶ رجون ۱۸۵۷ء کو وائسرائے نے ایک حکم نامہ جاری کیا تھا۔ جس کی رُو سے ہر مقام کے بڑے افسر کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ جہاں کوئی شخص فوجیوں کو ورغلاتا ہوا پایا جائے۔ اُسے موت کی سزا دی جائے۔ لارڈ کیننگ نے بعدازاں اس سلسلے کی بعض کارروائیوں میں مداخلت کی۔ اس پر لندن ٹائمز نے طنزاً کیننگ کو پیکرِ رحم قرار دیا۔ کیننگ کے قدرے نرم طرزِ عمل پر اس قدر غیظ و غضب پیدا ہوگیا تھا۔ کہ ایک انگریز نے کہا۔ کہ اگر مجھے کیننگ پر پستول چلانے کا موقع مل جائے۔ تو اسے حبِ وطن کا بلند ترین کارنامہ سمجھوں گا۔

حقیقت حال کا اعتراف

بنگال کے حاکم نے ایک مرتبہ لارڈ کیننگ سے اس معاملے کے متعلق گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی انصاف آموز تدابیر کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات سے سخت متاثر تھا۔ لیکن اپنی میز کی دراز سے کاغذات کا ایک پلندہ دکھلا کر اس نے کہا کہ ذرہ ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ میں نے ہنگامی عدالتوں کے آغاز سے بعض کے کاروبار کی چھان بین بڑی احتیاط سے کرائی ہے۔

> ان سے جبر، ظلم اور بے انصافی کے نہایت وحشیانہ اور خوفناک سلسلے کا انکشاف ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان عدالتوں نے محض ہراس زدگی کے زیرِ اثر ایسے فیصلوں سے اپنا دامن آلودہ کیا۔ جنہیں اندھا دھند عدالتی کشت و خون کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔۔۔۔

جب حاکم بنگال نے کہا کہ انہیں شائع کر دینا چاہیئے۔ تاکہ حقیقتِ حال سب پر واضح ہو جائے تو کیننگ نے جواب دیا۔ ہرگز نہیں۔ میں اپنی بدنامی اور رسوائی برداشت کرلوں گا۔ لیکن وہ حقائق منظرِ عام پر نہیں لاؤں گا جو میرے ہم وطنوں کے لیے دنیا میں خوفناک رسوائی کا باعث بنیں گے۔ میرے لیے یہی بس کرتا ہے کہ آئندہ کے لیے ایسے واقعات کا صدور روک دیا جائے۔

یہ وقت کے سب سے بڑے انگریز حاکم کا اعتراف ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کچھ کہنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

تعداد مقتولین

انگریزی تاریخوں میں مقتولین کی تعداد صرف سولہ لکھی گئی ہے جو بالکل غلط ہے۔ سید کمال الدین حیدر نے لکھا ہے۔

> ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن برابر قتلِ عام رہا۔ اس کا حساب نہیں۔ اپنے نزدیک گویا تیموریہ نسل کو نہ رکھا۔ مٹا دیا۔ بچوں تک کو مار ڈالا۔ عورات سے جو سلوک کیا، بیان سے باہر ہے جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔ انگریز چاہتے تھے کہ شہر دہلی کو ڈھا کر ویران کر ڈالا جائے ـــ لال قلعے کا نشان مٹا دیا جائے۔ شاہجہاں کی بنائی ہوئی مسجد جامع کو زمین بوس کر دیا جائے۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو دہلی کی زمین کو اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیتے۔

باس ورتھ سمتھ نے لکھا ہے۔۔۔

بعض افسر وحشی بربریت کے جوش میں اصرار کر رہے تھے کہ شہر کو جو ہندوستان کا سرمایہ افتخار اور اس کا دارالحکومت تھا۔ جسے ملک میں روضۃ الکبریٰ کی حیثیت حاصل تھی۔ ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا جائے ـــ اور زمین کو شورزار بنا دیا جائے۔ دوسرے اس سے بھی چند قدم آگے بڑھ کر مذہبی بربریت کے جنون میں اس بات پر زور دے رہے تھے کہ جامع مسجد کو جو دنیا کی شاندار ترین اور نفیس ترین عمارتوں میں سے تھی۔ کھنڈر بنا دیا جائے۔ یا کم از کم اس کے کلس پر صلیب نصب کر کے گرجے کی شکل میں تبدیل کر لیا جائے۔ مسیحی فتح کا یہ حد درجہ غیر مسیحی نشان متصور ہوتا۔ ایک بڑے گروہ کا اصرار یہ تھا کہ رفیع الشان شاہی محل لال قلعہ کو مسمار و برباد کر دیا جائے۔ تاکہ جو یہاں سے گزرے۔ پڑھ لے کہ مغلوں کا آخری نشان مٹ گیا۔

خون کے اس دھارے میں جو اس نے بہایا۔ وہ برباد ہو گیا۔ اُمید سے خالی، نفرت کا ہدف۔ کھنڈروں میں مدفون، ہجوم میں غرق۔

شہر میں ہل چلانے کی تجویز

چنگیز خاں کے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔ کہ نیشاپور کے محاصرے میں اس کا داماد مارا گیا۔ لہٰذا اُس نے حلف اُٹھایا کہ نیشاپور کو ویران کر کے دم لے گا۔ چنانچہ شہر فتح ہوا تو پوری آبادی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ نہ کوئی مرد زندہ چھوڑا۔ نہ عورت، نہ بچہ۔ پھر جانوروں کی باری آئی۔ بیل، گھوڑے، گدھے، اونٹ، بھیڑ، بکریاں غرض ہر شے ختم کر دی گئی۔ یہاں تک کہ کتوں اور بلیوں کو بھی نہ چھوڑا گیا، اور شہر کو ڈھا کر ہل چلوا دیے۔ چنانچہ ایک قرن تک نیشاپور کی جگہ کھیتی باڑی ہوتی رہی۔ بالکل اسی قسم کی تجویز انگریزوں نے جان لارنس کے روبرو پیش کی تھی۔

ـــ باس ورتھ نے لکھا ہے کہ ـــ

لارنس کے دوستوں نے دہلی شہر میں ہل چلوا دینے کی تجویز پیش کی تو اس نے کرنیل برن کو لکھا۔

> میں کبھی اس تجویز کو منظور نہ کروں گا۔ ہمیں مذہبی عمارتوں کی بربادی سے بالاہتمام احتراز کرنا چاہیئے۔ نہ دوستوں کی خوشنودی کے لیے ایسا کوئی قدم اُٹھایا جاسکتا ہے اور نہ دشمنوں کو آزار پہنچانے کے لیے۔

لارنس آباد

دہلی کا نشان مٹا دینے کی تجویز مانی گئی تو انگریزوں نے زور دیا کہ شہر کا نام شاہ جہاں آباد کی جگہ لارنس آباد رکھا جائے معلوم نہیں ذمہ دار حکام نے اس باب میں کیا کچھ کیا۔ لیکن اس سے پیشتر بھی دہلی کے نام مختلف بادشاہوں نے بدلے تھے۔ کسی کو بھی فروغ حاصل نہ ہوا۔ سب سے زیادہ شہرت شاہ جہاں آباد نے پائی۔ تاہم دہلی کی ہردلعزیزی کے سامنے شاہ جہاں آباد کا چراغ بھی روشن نہ رہ سکا۔ لارنس آباد کب عام لوگوں کی زبان پر چڑھ سکتا تھا نئی دہلی کا نام بھی ابتدا میں "جارج آباد" تجویز ہوا تھا۔ وہ بھی اس وجہ سے ترک کر دیا گیا کہ اس میں "دہلی" کی سی جاذبیت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

انہدام اور اس کا مقصد

بایں ہمہ شہر میں خاصی عمارتیں ڈھا دی گئیں اور کچھ جل کر تباہ ہو گئیں۔ مولوی ذکاءاللہ فرماتے ہیں کہ بعض مکانات میں کسی سبب سے آگ لگ جاتی تھی۔ لیکن آگ خود بخود کیونکر لگ سکتی تھی۔ شہر میں سے لوگ نکل چکے تھے۔ یقیناً یہ آگ فوجی لگاتے ہوں گے۔

جو عمارتیں انگریزوں نے منہدم کرائیں ان کا مقصد یہ بتایا گیا۔۔۔

۱. قلعے کے سامنے میدان ضروری تھا۔

۲. جامع مسجد کے اردگرد پچیس پچیس فٹ کھلی جگہ لازم تھی۔

۳. ریلوے سٹیشن اور ریلوے لائن کے لیے جگہ پیدا کرنا منظور تھا۔ قلعے کے سامنے کے مکانات ہاتھیوں سے منہدم کرائے گئے۔ اول ان کا کاٹ نیلام ہوا۔ اینٹ، پتھر قلعے کی خندق کا پشتہ بنانے کے کام آئے۔ میدان بن گیا تو پھر اس کے مضبوط درخت نیلام ہوئے۔ مکانوں کی بنیادوں کے پتھر بیچے گئے۔ بعض مکانات ثابت کے ثابت اینٹ پتھر سے بھر کر برابر کر دیے گئے تھے۔ اب وہ پھر کھود کر نکالے گئے۔

اینڈریوز نے مولوی صاحب کی زبانی لکھا ہے۔

> فتح دہلی کے بعد فوج کے افسر اور سپاہی پہنچے اور بچے کھچے مکانوں کو حکم سے خالی کرا لیا کہ یہ سارا محلہ منہدم کرا لیا جائے گا۔ ایک گھنٹے کے اندر لوگ صدیوں کے بسے ہوئے گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور تمام محلہ بارود سے اُڑا دیا گیا۔

لال قلعہ کی پہلی حالت باقی نہ رکھی گئی۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء تک اندر دس ہزار کی آبادی تھی جو عمارتیں فتح کے بعد انگریزوں نے توڑیں ان کی سرسری کیفیت یہ ہے۔

۱. امیروں اور شہزادوں کے تمام محلات توڑ دیے گئے۔

۲. دیوانِ عام کا صرف ہال باقی رہ گیا۔ اس کی باقی چیزیں توڑ دی گئیں اور یہ بھی اب ڈھانچا ہی ڈھانچہ ہے۔ شاہی عہد کے دیوانِ عام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایوانِ عام کے قریب سب سے بڑا شاہی محل تھا۔ جس کا نام رنگ محل تھا اور اسے امتیاز محل بھی کہتے تھے۔ وہ باقی ہے۔ لیکن اس کے فوارے حوض اور دوسری چیزیں کوئی بھی باقی نہ رہیں۔

۳. موتی محل۔ یہ محل ہیرا محل کے شمال میں اور باغ حیات بخش کی مشرقی آبشار کے سامنے تھا۔ انگریزوں نے اُسے توڑ کر توپ خانہ کی بارک بنائی۔

۴. باغ حیات بخش بھی تباہ کر دیا گیا تھا۔ اور ۱۹۰۲ء تک ملبے کے نیچے دبا رہا۔ اس کا کچھ حصہ بارکوں میں آ گیا تھا۔ کچھ سڑکوں میں۔ باقی باغ کو پھر سے رونق دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن پہلی حالت کی جھلک بھی اس میں نظر نہیں آتی۔

۵. مہتاب باغ بالکل اجڑ گیا۔ اس کے حوض کو مدت تک گوروں نے پیراکی کا حوض بنا رکھا تھا۔

۶. ظفر محل یا جل محل کی پہلی شان جاتی رہی۔

۷. چھوٹی بیٹھک یعنی خورد جہاں مٹ گیا۔

۸. ممتاز محل آج کل آثارِ قدیمہ کا عجائب خانہ ہے۔

۹. دیوانِ عام کے شمال میں مطبخ شاہی تھا۔ اس کا نشان تک باقی نہیں رہا۔ اس حصے میں بے ڈھنگی بارکیں انگریزوں نے کھڑی کر دیں۔

۱۰. دیوانِ عام اور دیوانِ خاص کے درمیانی حصے اور لال پردے کا بھی کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

فتح دہلی کے بعد انگریزوں کے جنون کی بجلیوں سے مسجدیں بھی محفوظ نہ رہیں۔ چھوٹی مسجدوں کا شمار تو ممکن نہیں بڑی مسجدیں بھی ختم ہو گئیں۔

مسجدیں

اکبر آبادی مسجد فیض بازار میں تھی اور شاہجہاں کی بیگم اعزاز النساءؒ نے بنوائی تھی۔ جس کا خطاب اکبر آبادی محل تھا۔ مسجد کا مسقف حصہ تریسٹھ گز لمبا اور سترہ گز چوڑا تھا۔ جس کے تین گنبد اور سات در تھے۔ دائیں بائیں دو خوبصورت اور بلند مینار تھے۔ تریسٹھ گز لمبا اور تریسٹھ گز چوڑا صحن تھا جو زمین سے تین گز اونچا تھا۔ اس کے گرد تین گز اونچا کٹہرا بنا ہوا تھا۔ صحن کے سامنے وضو کے لیے حوض تھا۔ حوض کے پاس سے مسجد میں جانے کے لیے سیڑھیاں بنادی گئی تھیں۔ پوری عمارت سنگ سرخ کی تھی۔ سامنے کی طرف سنگ مرمر کی بیلیں بنی ہوئی تھیں۔ مسجد کے شمال جنوب اور مغرب میں تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر خوب کھلے اور صاف حجروں کی قطاریں تھیں۔

حجروں کے سامنے برآمدہ تھا گویا مسجد بطور خاص اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ طلبہ حجروں میں رہیں اور مسجد میں تعلیم پائیں شاہ عبدالقادر محدث اور شاہ رفیع الدین محدثؒ مدت تک یہاں درس دیتے رہے۔ سید احمد شہید بریلوی نے اپنی تحریک کا لائحہ عمل اِسی مسجد کے حجروں میں تیار کیا تھا۔

اس مسجد سے قلعے کے لاہوری دروازے تک کا بازار اردو بازار کہلاتا تھا۔ انگریزوں نے قلعے کے درمیانی حصے میں میدان نکالنے کے لیے جہاں سینکڑوں مکان گرا لیے۔ وہاں یہ مسجد بھی شہید کرادی حالانکہ اگر اسے محفوظ رکھا جاتا۔ تو میدان اور عام منظر کی خوبصورتی بہت بڑھ جاتی اور ایک عالی شان عبادت گاہ بچی رہتی۔

۲. اورنگ آبادی مسجد

یہ مسجد پنجابی کٹڑے میں تھی جو سٹیشن اور ریلوے لائن میں آگیا۔ مسجد اس جگہ تھی۔ جہاں آج کل بڑا سٹیشن ہے۔ پوری عمارت سنگ سرخ کی نہایت خوش وضع اور خوبصورت تھی۔ اس میں مولوی عبدالخالق امام تھے۔ جو شمس العلماء مولانا نذیر احمد کے خسر تھے۔ شیخ الکل میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی نے ابتدا میں یہیں درس شروع کیا تھا۔ پھر یہ مسجد انگریزوں نے منہدم کرادی تو وہ پھاٹک حبش خاں میں چلے گئے۔

۳. چربی مسجد

قلعے کے اندر مہتاب باغ سے آگے نکل کر شاہی مطبخ کے پاس تھی۔ انگریزوں نے تڑوادی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی وضع و ہیئت کیا تھی۔

۴. جامع شاہ جہانی

یہ مسجد اپنی شان و شوکت خوبصورتی اور دل آویزی کے لحاظ سے دنیا کی چند بہترین مسجدوں اور عبادت گاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ انگریز اسے گرا دینے یا گرجا بنا لینے کے خواہاں تھے۔۔۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ انگریزی فوج کے حملے کے وقت مسجد کے دروازے پر مسلمانوں نے سخت مقابلہ کیا تھا اور انگریزی فوج کو پسپائی پر مجبور کر دیا تھا۔۔۔

سید ظہیر دہلوی کے بیان کے مطابق اس لڑائی میں انگریزی فوج مسجد کی سیڑھیوں تک آن پہنچی تھی۔ اور فوج کے کچھ لوگ رعایا کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے۔ ادھر فوجیوں نے یہ چاہا کہ جامع مسجد میں داخل ہو جائیں۔ مسجد میں جو مسلمان مسافر جمع تھے انہوں نے دیکھا کہ اب یہ خدا کے گھر میں آن کر کشت و خون کریں گے تو بہتر یہ ہے کہ مسجد سے نیچے اتر کر ان سے سمجھ لیں۔ یہ کہہ کر وہ مسجد کے دروازے سے باہر نکل کر سیڑھیوں پر سے اترنے لگے۔ فوج والوں نے ان پر بندوقوں سے فائر کیے۔ جو زندہ بچے وہ سامنے چلے گئے اور باہم جنگ مغلوبہ دست بدست ہونے لگی۔ ایک غل شور برپا ہوا اور بلوہ ہو گیا۔ لوگ گھروں میں سے لکڑیاں، پلنگ کی پٹیاں، تلواریں لے لے

کر دوڑ پڑے۔ ان بزن میں کچھ مارے گئے۔ باقی بھاگ کر اپنے لشکر میں چلے گئے۔

سکھوں کا کیمپ

فتح کے بعد گورے یا تو قلعے میں چلے گئے یا انہوں نے زینت المساجد میں اپنا مرکز قائم کر لیا۔ سکھوں کا لشکر جامع مسجد میں قائم ہو گیا۔

مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں کہ مندروں کی ایسی دُردشا کی کہ ہنود (ہندو) دہلی میں دوبارہ آباد ہوئے تو انہیں اپنے تمام مندروں کو خاص رسوم ادا کر کے پوتر کرنا پڑا۔

> جامع مسجد شہر کی کل مساجد کی ناک تھی۔ اس کو یوں نکٹا بنایا کہ سکھ سپاہ کی بارک اس کو بنایا۔ اس میں بول و براز کرنے سے کچھ پرہیز انہوں نے نہیں کیا۔ سکھوں نے اپنے کڑھائے حلوے کے سُرخ مینار کے نیچے خوب چڑھائے۔ سؤر ذبح کر کے پکائے۔ کتے جو انگریزوں کے ساتھ تھے۔ وہ درگاہ شریف میں پڑے پھرتے تھے۔

شہر خالی پڑا تھا۔ بڑی بڑی حویلیوں اور عمارتوں کا شمار نہ تھا۔ سکھوں کو یا دوسرے دستوں کو کہیں بھی ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ لیکن انگریزوں کا جوشِ انتقام انہیں کسی طرح بھی دم نہ لینے دیتا تھا، اور وہ ایسی حرکتیں کرتے تھے جو مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ اشتعال انگیز اور نفرت خیز ہوں۔

مسجد کی بندش

پھر مسجد کو بند کر کے پہرے لگا دیے گئے۔ مرزا قربان علی بیگ سالک نے اپنی نظم "جہان آباد" کے مندرجہ ذیل بند میں کس درد سے لکھا ہے۔

حرم مسجد جامع کا کیا کروں اظہار
صف ملائکہ ہوتی جہاں نماز گزار
ہر ایک صف میں رہتا مصلیوں کا شمار
اب اس کو دُور ہی سے دیکھنا ہوا دشوار
نماز ہے نہ اذان ہے، نہ کوئی جاتا ہے
جب اس کو دیکھیے خالی تو جی بھر آتا ہے

پانچ سال تک تو انگریز بالکل چپ بیٹھے رہے۔ اور مسجد کو بدستور اپنے قبضے میں رکھا حالانکہ اس اثنا میں متعدد بڑے بڑے حاکم دہلی کا دورہ کر چکے تھے۔ غالب کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ جولائی ۱۸۶۲ء میں پرستش کا آغاز ہوا۔ اور مسجد کی واگزاشت کا سلسلہ چلا۔ نومبر ۱۸۶۲ء میں مسجد واگزار ہوئی۔ اور دس آدمیوں کی ایک کمیٹی انتظام نگرانی کے لیے بنا دی گئی۔

واگزاشت کی شرطیں

یہ مسجد بلا شرط و قید واگزار نہیں ہوئی تھی استعمالِ مسجد کے لیے شرطیں مقرر کی گئی تھیں۔ جو اقرار نامے میں بطور ہدایات مرقوم تھیں۔

۱۔ ادائے نماز کے بعد سب آدمی مسجد سے باہر چلے جایا کریں۔
۲۔ مؤذن اور امام کے سوا رات کو کوئی شخص مسجد میں نہ رہے۔
۳۔ ہندو بلا مزاحمت مسجد کے اندر آئیں مگر انہیں ادب ملحوظ رکھنا چاہیے۔
۴۔ سول اور فوج کے افسر بھی اندر آنے کے مجاز ہوں گے۔ انہیں جوتا اتارنے کی احتیاج نہیں۔ اُمید ہے کہ وہ کتے ساتھ نہیں لائیں گے اور سگریٹ وغیرہ نہ پییں گے۔
۵۔ فوجی گورے کمان افسر یا حاکم ضلع سے پاس لیے بغیر اندر نہ جائیں گے۔
۶۔ دو سنتری شمالی اور جنوبی دروازوں پر متعین رہیں گے اور ان کی تنخواہ کی ذمہ دار کمیٹی ہوگی۔

اس کے علاوہ کمیٹی نے جو ذمہ داریاں اُٹھائی تھیں۔ وہ یہ ہیں۔

۱۔ مسجد میں کوئی دنگا فساد نہ ہوگا۔
۲۔ اگر کوئی مقدمہ مسجد کے بارے میں قائم ہوگا۔ تو اس کا فیصلہ ہم خود کریں گے۔
۳۔ مسجد میں کوئی ایسی بات نہ ہوگی۔ جو سرکار کی توقیر و اہانت یا بدخواہی کی موجب ہو۔ اگر کوئی ایسی بات ہوگی اور کمیٹی اس کا تدارک نہیں کر سکے گی تو ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دے گی۔
۴۔ کمیٹی مرمت کی ذمہ دار ہوگی۔ آمد و خرچ کا حساب باقاعدہ رکھے گی۔
۵۔ کمیٹی کا کوئی ممبر کم ہو جائے۔ تو اس کی جگہ ممبر نیا آدمی تجویز کریں گے۔
۶۔ اگر کوئی امر خلافِ مرضی سرکار ظہور میں آئے تو سرکار مسجد کو بند کر دینے کی مجاز ہوگی۔

کمیٹی کے دس ممبر تھے۔

مرزا الٰہی بخش۔
مفتی صدر الدین آزردہ۔
محمد ابراہیم۔
محمد ابراہیم ثانی۔
محمد حسین۔
نصیر الدین۔
تراب علی۔
حافظ داؤد
محمد تفضل حسین۔
محبوب بخش۔

حافظ سید محمد، امام مسجد۔ مولوی تراب علی نے یہ اقرار نامہ لکھا اور ۲۴ر نومبر ۱۸۶۲ء کو اس پر دستخط ہوئے۔

بعد کی حالت

بڑی مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ انگریز جوتا پہنے ہوئے مسجد میں جاتے مسلمانوں کے دل دُکھتے۔ لیکن وہ مجبور تھے۔ اگر شکایت کرتے تو انگریز دوبارہ مسجد کو بند کر دیتے۔

لارڈ کرزن نے ۱۸۹۹ء میں مسجد دیکھی تو بہ طور خود بوٹوں پر موزے پہن لیے۔ یہ گویا عام انگریز افسروں کے لیے ایک عملی ہدایت نامہ تھا۔ اس کے بعد کمیٹی نے موزے بنوا کر رکھ دیے جو انگریز افسر اندر داخل ہوتے وقت پہن لیتے۔

مسجد فتح پوری

چاندنی چوک کے مغربی سرے پر یہ مسجد دہلی میں بلحاظ عظمت دوسرے درجے پر ہے۔ اس کی دکانیں فتح شہر کے بعد ضبط کر لی گئی تھیں اور عجیب امر یہ ہے کہ ان کے نیلام کا بھی فیصلہ کر لیا اور مسلمانوں کو خبر تک نہ ہونے دی۔ لالہ چھنّا مل رئیس نے انتیس ہزار میں خرید لیں۔ مسلمانوں نے مدت کے بعد قانونِ وقف کے مطابق اس سودے کی تنسیخ کی درخواست پیش کی اور یہ درخواست منظور ہو گئی۔ حکومت نے چاہا کہ لالہ چھنّا مل دکانیں چھوڑ دے۔ اور اپنی رقم مع سود لے لے جو ایک لاکھ دس ہزار بنتی تھی۔ اس کے بدلے تحصیل پلول کا ایک موضع دینا چاہا۔ لیکن لالہ چھنّا مل نے انکار کر دیا۔

آخر دکانوں کے جمع شدہ کرایے اور موضع کی نیلامی سے ایک لاکھ دس ہزار

کی رقم دے کر مسجد کی گئی جائیداد واپس لی گئی۔

غدر کا پس منظر اور اثرات

اپنی تصنیف کمپنی کی حکومت میں مشہور ادیب اور مؤرخ باری علیگ جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء کے باب میں یوں لکھتے ہیں۔ "۱۸۵۷ء کا حادثہ ایک فطری نتیجہ تھا۔ کمپنی کے صد سالہ دورِ حکومت کا ایک ردِ عمل تھا۔ قوتِ مقتدرہ کے خلاف ایک کش مکش تھی۔ مظلوم انسانوں کی ایک مسلح بغاوت تھی، انقلاب کے لیے ایک منظم کوشش تھی قومیتِ متحدہ کی خاطر بغاوت یا انقلاب کے اسباب جذباتی نہیں ہوا کرتے۔ صرف چربی والے کارتوسوں کے استعمال کا حکم اتنی اہم تحریک کا سبب نہیں مانا جا سکتا۔ ۱۸۵۷ء کے حادثے کے اسباب وہ تمام واقعات ہیں جن کا مطالعہ آپ گزشتہ اوراق میں کر چکے ہیں۔ چربی والے کارتوسوں نے محض توڑے دار بارود میں چنگاری کا کام کیا۔ ڈلہوزی کا الحاق اور نصرانیت کی اشاعت اس حادثہ کے سب سے اہم اسباب ہیں۔"

بنگال مورخ بابو رمیش چندر دت لکھتا ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں شمالی اور وسطی ہندوستان کی فوج میں بغاوت شروع ہوئی۔ لیکن بعض سیاسی اسباب کی وجہ سے اس نے وہاں بڑی بڑی جماعتوں میں پھیل کر ایک عام سیاسی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں ہندوستان کے بڑے بڑے حصوں کو یکے بعد دیگرے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل کیے جانے کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہوئے کہ کمپنی نے تمام معاہدات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ لوگوں میں عام بے چینی تو موجود ہی تھی جس سے بغاوت کے رہنماؤں نے فائدہ اٹھا کر اشتہارات اور اعلانات کے ذریعے لوگوں کو غیر ملیوں یعنی انگریزوں کی بد عہدی اور ہوسِ ملک گیری کی پالیسی کی طرف توجہ دلائی۔"

بنگال کی دیسی پلٹن کے ایک سپاہی منگل پانڈے نے نہ صرف چربی والے کارتوس کے استعمال سے انکار کر دیا بلکہ ایک انگریز افسر کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ منگل پانڈے کو پھانسی دے دی گئی اور اس کی پلٹن کو علیحدہ کر دیا گیا۔ میرٹھ کے فوجی افسروں نے چربی والے کارتوسوں کا تجربہ کرنا چاہا۔ چنانچہ انہوں نے ۱ مئی ۱۸۵۷ء کو حکم دیا کہ دیسی سپاہی چربی والے کارتوس استعمال کریں۔ ۸۵ سپاہیوں نے کارتوس چھونے سے انکار کر دیا۔ تاریخ "جنگ سپاہ" کا مصنف لکھتا ہے۔

"بندوق اور سنگینوں کے پہرے میں پچاسی جوانوں کو فوجی لباس میں سپاہیوں کی حیثیت میں فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ سزا کو بلند آواز سے سنایا گیا جس کا مقصد سپاہیوں کو بدکار مجرموں کی فہرست میں داخل کرنا تھا۔ ان سے فوجی نشانات چھین لیے گئے، پشت کی طرف سے ان کی وردیاں پھاڑ دی گئیں۔ لوہار زنجیریں اور آلات لے کر آگے بڑھے۔ آناً فاناً پچاسی جوان اپنے ساتھیوں کے اس وسیع مجمع کے سامنے انتہائی بے عزتی کی تمام روش اور ظاہر علامات یعنی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں نظر آئے۔ یہ نہایت ہی دردناک اور ذلت آفرین نظارہ تھا۔ سپاہی بے حد متاثر ہوئے جب انہوں نے اپنے بدقسمت ساتھیوں کی ناگفتہ بہ حالت اور مایوسانہ انداز کو دیکھا۔ ان میں سے بعض اپنی پلٹن میں ہر دل عزیز تھے۔ ان میں کئی اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر برطانوی حکومت کی ترقی کے لیے اپنی وفاداری کا ثبوت دے چکے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوتے اور اس بے عزتی کو خاموشی سے برداشت کرنے پر انہیں شرمندہ کیا اور غیرت دلائی۔ اس وقت ایک بھی سپاہی اس میدان میں ایسا نہ تھا جس نے اپنے سینے میں اس واقعہ سے نفرت و رنج کے جذبات پیدا ہوتے ہوئے محسوس نہ کیے ہوں۔ لیکن بھری ہوئی میدانی توپیں، بندوقوں اور سواروں کے چمکتے خنجروں کی موجودگی میں حملہ کرنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ قیدیوں کو ان کی کوٹھڑی میں لے گئے۔ پہرہ دینے کے لیے انہیں کے ساتھیوں کو مقرر کیا گیا۔"

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے دیسی سپاہیوں نے علانیہ بغاوت کر دی۔ متعدد فوجی اور سول افسر قتل کر دیے گئے۔ انقلاب پسند جیل کی طرف روانہ ہوئے جہاں ۸۵ مجرم مقید تھے۔ زندان کے دروازے توڑ دیے گئے۔ انقلاب پسند لوہاروں نے ۸۵ قیدیوں کی زنجیریں کاٹ دیں۔ میرٹھ کا ہر وہ مقام جسے کمپنی سے دور کا بھی تعلق تھا۔ نذرِ آتش کر دیا گیا۔ ٹیلیگراف کے تار کاٹ دیے گئے۔ جمنا عبور کرنے کے بعد انقلاب پسند دہلی کی دیواروں کے نیچے تھے۔ دہلی کی انگریزی فوجوں کے دیسی سپاہیوں نے میرٹھ کے انقلاب پسندوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ میرٹھ اور دہلی کے انقلاب پسندوں نے انگریزی افسروں کو قتل کر دیا۔ انقلاب پسند جنگی ترانے گاتے کشمیری دروازے سے دہلی میں داخل ہو گئے۔ انقلاب پسندوں نے بہادر شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ چاروں طرف سے انگریزی فوجیں دہلی کی طرف روانہ ہوئیں۔ ۲۳ مئی کو شدید ترین لڑائی ہوئی۔ انقلاب پسندوں کو ایک رہنما کی ضرورت تھی۔ اس کمی کو بخت خان روہیلہ نے پورا کر دیا۔ بخت خان انگریزی فوجوں سے لڑتا رہا۔ انگریزی فوجوں کا افسرِ اعلیٰ مایوس ہو چکا تھا کہ سر جان لارنس نے جنرل نکلسن کی زیرِ کمان عسکری مدد بھیجی۔ چار ماہ تک انقلاب پسند انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے رہے۔ انگریزی فوجوں کے داخلے نے نادر شاہی لوٹ کو حرفِ پارینہ بنا دیا۔

"ہماری فوجوں کے مظالم کا تذکرہ روح میں کپکپی پیدا کر دیتا..... بہت بری طرح سے انتقام لیا جا رہا ہے۔ یہاں تک لوٹ مار کا تعلق ہے ہم نادر شاہ سے بازی لے گئے ہیں۔"

لارڈ الفنسٹن لکھتا ہے۔

"بہادر شاہ کے دو بیٹوں کو گولی کا نشانہ بنا کر ان کی نعشوں کو بے گور و کفن بازار میں پھینک دیا۔ بہادر شاہ کو جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا۔"

اودھ کے حالات

الحاق اودھ نے جاگیرداروں کی مالی حالت کو بہت خراب کر دیا۔ شاہ اودھ کے برخاست شدہ فوجی افسر اور سپاہی معاش کا شکار ہو رہے تھے۔ جاگیرداروں، فوجی افسروں اور سپاہیوں نے اپنی بدحالی کا راز الحاقِ اودھ میں پایا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کمپنی کی حکومت ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اودھ کے جدید صوبہ کا افسرِ اعلیٰ سر ہنری لارنس کو مقرر کیا گیا۔ ہنری لارنس نے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود، بداطمینانی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ انقلاب پسندوں کی جماعت بہت مضبوط ہو گئی۔ جب لکھنؤ کے انقلابیوں کو میرٹھ اور دہلی کے واقعات کا علم ہوا تو انہوں نے بھی برطانوی ریزیڈنسی کا محاصرہ کر لیا۔ اودھ ایک مشین کی مانند تھا۔ جس کا ہر پرزہ انقلاب کے لیے حرکت کر رہا تھا۔ انقلاب پسندوں نے واجد علی شاہ کے بیٹے کو ملکہ حضرت محل کی سرپرستی میں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ انگریز محصورین کی مدد کے لیے جنرل اوٹرم اور جنرل ہیولاک لکھنؤ کی طرف بڑھے لیکن دونوں جرنیل اپنی فوجوں سمیت محصور ہو گئے۔ آخر سر کولن کیمبل کی آمد پر انقلاب

پسندوں کو پسپا ہونا پڑا۔ خاص بازاروں کے در و دیوار خون سے رنگین تھے۔ عالم باغ، دلکشا باغ اور سکندر باغ کے ہر پھول پر لالۂ خونیں نوا کا گمان ہوتا تھا۔

۱۵ مئی کو کانپور میں انقلاب کے آثار دکھائی دیئے ہم۔ جون کی شام کو آندھی چلی، ٹمٹماتے چراغ آندھیوں سے بجھ جاتے ہیں لیکن راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں شعلوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ انقلاب پسندوں نے نانا صاحب کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ ۲۵ جون کو کانپور انگریزی اثرات سے خالی ہو گیا۔ یکم جولائی کو نانا صاحب انقلاب پسند تلواروں کے زیر سایہ تخت نشین ہوا۔ نانا صاحب کانپور کا حکمران بن گیا۔

نانا صاحب نے ان انگریز سپاہیوں کی حفاظت کا ذمہ لیا جو الہ آباد جانا چاہتے تھے لیکن جب انگریز کشتیوں پر سوار ہونے لگے تو بعض انقلاب پسندوں نے ان پر گولی چلا دی۔ جب ان واقعات کا علم جنرل ہیولاک کو ہوا تو وہ اپنی فوج سمیت کانپور کی طرف بڑھا۔ ہیولاک کانپور پر قابض ہو گیا۔ لیکن نانا کے وزیر تانتیا ٹوپی نے انگریزوں کو کانپور سے ایک دفعہ پھر نکال دیا۔ آخر سر کولن کیمبل نے کانپور فتح کیا۔

ژاں دارک نے اپنی شجاعت سے فرانس کی مردہ رگوں میں خون زندگی دوڑا دیا۔ چاند بی بی نے اپنی بہادری سے شاہی حکمرانوں کے منہ موڑ دیئے۔ لکشمی بائی نے اپنے جیریلے کارناموں سے انگریز حکومت کو ششدر کر دیا۔ ان تینوں خواتین کی زندگی اور موت میں بہت مشابہت ہے۔ ژاں دارک اور لکشمی بائی کی چتاؤں سے اٹھے ہوئے شعلے آج بھی اپنے اندر قصر استبداد کو جلانے کی تپش رکھتے ہیں۔ مرقد چاند بی بی کشمکش حریت میں شرکت کی دعوت دے رہا ہے۔

پیشوا نے ۱۸۱۷ء میں جھانسی کو انگریزوں کے حوالے کیا۔ ۱۸۴۲ء میں کمپنی نے گنگا دھر راؤ سے ایک نیا معاہدہ کیا۔ اس معاہدے نے راجہ کے اختیارات اور فوج کو کم کر دیا۔ راجہ کی وفات پر رانی لکشمی بائی نے کمپنی سے درخواست کی کہ وہ اس کے متبنےٰ کو جھانسی کا راجہ تسلیم کرے۔ لارڈ ڈلہوزی نے اس کی درخواست کو نامنظور کر دیا۔ جھانسی کو کمپنی کی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔

• وہ صبر کر لیتی، مگر پوری ریاست ہضم کر لینے کے بعد بھی توند غلطے کا پیٹ نہ بھرا اور طاقت کے نشے میں مست ہو کر اس بیچاری سے اس کے مرحوم شوہر کے قرضہ جات طلب کیے اور اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے قلیل گزارہ میں سے جو اس فلک زدہ کے لیے بھی ناکافی تھا، یہ گراں قدر مطالبات ادا کرے۔"

• وہ عورت تھی۔ جس کے غضب کو چھیڑنا آگ سے کھیلنے کی طرح خطرناک تھا۔"

"شروع شروع میں تو وہ اس جہاد آزادی سے دور رہی مگر جب موقع ملا تو وہ بھی اس مبارک ہنگامے میں شامل ہو گئی۔ وہ بالکل نڈر تھی اور دلیر بھی تھی اور پھر انگریزوں سے انتقام کی آگ اس کے دل میں لگی ہوئی تھی۔ اس کی بہادری نے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا لیا اور اکثر اپنے ملک، اپنی حکومت اور اپنی والی کے لیے جانیں قربان کر دینے پر تیار ہو گئے۔ اس نے شہر کو چھاؤنی میں تبدیل کر دیا۔ آخر جنگ چھڑ گئی۔"

• توپوں کے دل ہلا دینے والی آواز اور گولیوں کی ہلاکت آفرین بوچھاڑ کے درمیان قلعہ کی فصیل پر وہ خود بیٹھے کھڑی اپنے بہادر سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتی۔ اور سپاہی جوش میں آ کر اپنی جان پر کھیل جاتے۔ جب تک آفتاب شام کے پردے میں اپنا منہ نہ چھپا لیتا ان کی بندوقیں گولیاں برسانا بند نہ کرتیں۔ اور ان کی عورتیں زخمیوں کی مرہم پٹی اور گولہ بارود کی تقسیم سے غافل نہ ہوتیں۔"

" آخری منظر یہ تھا کہ وہ کچھ جانبازوں کے ساتھ آدھی رات کی تاریکی میں قلعہ سے بھاگ نکلنے پر مجبور ہو گئی تاکہ کسی محفوظ مقام پر پناہ لے کر حصول مقصد کے لیے دوبارہ کسی مناسب موقعہ کا انتظار کرے۔"

" بڑی جستجو کے بعد انگریزوں نے گوالیار کی گھاٹیوں کے درمیان ان سواروں کو دیکھ لیا اور ان پر دھاوا بول دیا۔ وہ بہادر بھی پلٹ پڑے۔ خونریز جنگ چھڑ گئی۔ ان ہی میں سپاہیانہ لباس پہنے وہ بھی اپنے سپاہیوں کے دوش بدوش آگ اور خون سے کھیل رہی تھی۔ ایک سنسناتی ہوئی گولی نے اسے زخمی کر دیا۔ اس موقعہ کو غنیمت جان کر دشمنوں کے ایک سپاہی نے اس پر تلوار سے وار کیا وہ گھوڑے سے گر گئی۔ انگریز اسے گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ مگر وہ قید حیات سے آزاد ہو چکی تھی۔

وہ مر گئی، اپنے وطن پر نثار ہو گئی۔"

اور پارلیمنٹ نے ۱۸۵۸ء میں ایک قانون کے ذریعے ہندوستان کو تاج برطانیہ کے ماتحت قرار دے دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں برصغیر کی حالت زار

ہندوستانی صنعت وحرفت کو ہم تباہ کر چلے ہیں

کیا تم از سر نو ہندوستان کو خوش حال کرنے کے لیے انگلستان کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہو؟ انگلستان یا ہندوستان دونوں میں سے کسی ایک کی صنعت و حرفت کا قربان کرنا دوسرے کی ترقی کے لیے لازمی ہے۔"

برڈکل ہرسٹ

" میں ہرگز ہندوستان کو از سر نو زندہ کرنے کے لیے نہیں کہتا۔ لیکن میں ہندوستان کو مسلسل نقصان پہنچانے کے خلاف ہوں۔ پھر یہ بھی لازم نہیں کہ ہندوستان نو، بافوں کی ترقی سے انگلستان برباد ہو جائے گا۔ کیونکہ ہندوستان کے پاس نہ گلاسگو اور مانچسٹر کی طرح مشینیں ہیں، نہ تجارتی بازار اور نہ سرمایہ۔" مارٹن

" آپ سے جو سوال کیا گیا ہے اس کا تعلق اس نفیس سوت سے ہے جو مشین میں تیار نہیں ہو سکتا۔ پس سوال یہ ہے کہ کیا اس نفیس سوت کی صنعت اس ملک میں رکھی جائے یا ہمیشہ کے لیے اٹھا دی جائے۔ برڈکل ہرسٹ

" اگر انگلستان میں صنعت کا بقا ہندوستان سے ناانصافی ہی پر موقوف ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ انگلستان کو انصاف سے کام لینا چاہیئے۔ خواہ اس کے نتائج کچھ ہوں۔ کیونکہ انگریزوں کو یہ ہرگز حق نہیں ہے کہ محض اپنے ذاتی مفاد کے لیے اس ملک کے باشندوں کو تباہ کر ڈالیں۔ جسے انہوں نے فتح کر لیا ہے۔"

مارٹن

" ۱۸۲۳ء میں جب کمپنی نے ہندوستان کو تاج کے حوالے کیا تو اس سے پہلے ہی ہندوستان کی صنعت تباہ ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس وقت تباہی کا سوال در پیش نہیں ہے جو واقع ہو چکی ہے۔ نیز ہمارے پاس شہادت موجود ہے کہ ہندوستان صنعتی ملک ہونے کی بجائے زرعی ملک ہے اور وہ جماعتیں جو پہلے دستکاری میں مصروف تھیں اب زراعت میں مشغول ہو گئی ہیں۔"

برڈکل ہرسٹ

" میں اسے ہرگز تسلیم نہیں کرتا کہ ہندوستان صرف زرعی ملک ہے۔ ہندوستان جس طرح زرعی ملک ہے اسی طرح صنعتی بھی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس کی مصنوعات نہایت کامیاب رہی ہیں اور کوئی قوم بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اب ہندوستان کو

عرف زراعتی ملک بنا دینا اس کے لیے سخت ناانصافی اور ظلم ہے۔" مارٹن

(پارلیمنٹری سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ ۱۸۴۵ء)

"ہندوستان نے پارچہ بافی کو ہر زمانہ میں بے نظیر کمال اور ناقابل تصور ہنرمندی کے ساتھ برقرار رکھا۔ اس کے بعض کپڑے تو ایسی حیرت انگیز نفاست سے تیار ہوتے ہیں کہ پرستان کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کمال دراصل ہندوستانیوں کے بہترین ذوق نفاست پسندی اور سلیقہ کا نتیجہ ہے۔"

(برنس ۱۷۲۴ء میں)

"سترھویں صدی کے آخر میں نفیس اور عمدہ ہندوستانی چھینٹ اور ململ بڑی مقدار میں انگلستان بھیجی گئی، اور وہاں اس قدر مقبول ہوئی کہ مقامی اونی ریشمی کپڑے کی تجارت سخت خطرے میں پڑ گئی۔ چنانچہ اس کی روک تھام کے لیے ۱۷۵۰ء اور ۱۸۲۱ء میں پارلیمنٹ نے ایسے قانون پاس کیے جن کی رو سے انگلستان میں ہندوستانی کپڑے کا استعمال قطعاً ممنوع قرار دے دیا۔"

پروفیسر لیکی

"۱۸۱۳ء تک برصغیر ہند کا سوتی اور ریشمی کپڑا انگلستان کے بازاروں میں معقول نفع کے ساتھ خود انگریزی کپڑے سے ۵۰ اور ۶۰ فیصدی کم قیمت پر بکتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی کپڑے کو بچانے کے لیے ہندوستانی کپڑے پر ۷۰ اور ۸۰ فیصد چنگی لگا دی گئی۔ اگر یہ ظالمانہ چنگی نہ لگائی جاتی اور ممانعت کے قانون نافذ نہ کیے جاتے تو مانچسٹر کے کارخانے شروع ہی میں بند ہو جاتے اور باوجود مشینوں کی قوت سے مسلح ہونے کے ہرگز نہ چل سکتے۔ درحقیقت یہ کارخانے ہندوستانی کپڑے کی لاش پر کھڑے کیے گئے ہیں۔ اگر ہندوستان خود مختار ہوتا تو وہ اس زیادتی کا ترکی بہ ترکی جواب دیتا۔ یعنی وہ انگریزی مصنوعات پر بھاری چنگی لگا دیتا اور اس طرح اپنی تجارت کو فنا ہونے سے بچا لیتا۔ مدافعت کا یہ حق ہندوستان کو نہیں دیا گیا۔ وہ بے رحم بدیشیوں کے رحم پر تھا۔ انگریزی مصنوعات بغیر چنگی ادا کیے جبراً ہندوستان میں رائج کی گئیں۔ بدیشی تاجروں نے غیر منصفانہ سیاسی حربے استعمال کر کے اپنے اس حریف کا گلا گھونٹ ڈالا جس سے وہ کسی طرح بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔"

(مل از تاریخ ہندوستان)

کہ پہلے انگلستان میں یہ سخت جرم تھا کہ کوئی عورت ہندوستانی چھینٹ استعمال کرے۔ ۱۷۶۶ء میں گلڈ ہال میں ایک انگریز خاتون کو دو ہزار پونڈ جرمانہ اس لیے ادا کرنا پڑا کہ اس کا رومال ہندوستانی کپڑے کا تھا۔"

پروفیسر لیکی

"۱۷۸۸ء سے ۱۸۵۲ء تک کا زمانہ انگلستان کی پارچہ بافی کا سنہرا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ یہی اس وقت جبکہ انگریزی کپڑے کی برآمد دخانی جہازوں کی طلسمی تیز رفتاری اور میکانکی ایجادات کی محیر العقول تاثیر کے تحت روز افزوں ترقی کر رہی تھی، ہندوستانی کپڑے پر ۷۵ فیصد چنگی لگا دی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈھاکہ کا نفیس کپڑا اس زبردست چنگی کی وجہ سے انگلستان جانا بند ہو گیا اور آخر کار یہ کپڑا انگلستان کے بازاروں سے بالکل ہی غائب ہو گیا۔"

پروفیسر ویر

"نور باف جب کمپنی کے سخت اور جابرانہ معاہدے منظور کرنے سے انکار کر دیتے تھے تو کمپنی کے ایجنٹ ان کا سامان نیلام کر کے ضبط کر لیتے تھے۔ باریک ریشم کاتنے والوں پر بھی یہی ظلم کیا جاتا تھا۔ ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ لوگوں کے انگوٹھے اس لیے کاٹ ڈالے گئے کہ وہ مہین اور باریک تاگا نہ بنا سکیں۔"

ولیم بولٹس

"کاریگروں کو کمپنی کے کام پر زبردستی مجبور کیا جاتا تھا۔ ان سے معاہدے کیے جاتے تھے ان کے حق میں سراسر نقصان دہ ہوتے تھے۔ ان کی فریادوں کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ انہیں اپنے ذاتی مفاد اور ضمیر کے خلاف کام کرنے پر بڑی سختی سے مجبور کیا جاتا تھا۔ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ کاریگروں کو بھاری بھاری جرمانے کام کرنے سے انکار کی وجہ سے ادا کرنے پڑتے تھے۔ نور بافوں کو ہولناک اور عبرتناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ جبر و تشدد کی حد یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ کاریگروں کو مجبوراً اپنا پیشہ ترک کرنا پڑا تھا۔"

(کمرشل بورڈ کی ڈائری)

"جب کمپنی کا کوئی گماشتہ کسی صنعتی شہر میں پہنچتا تو اپنے لیے آباد گھر میں کوئی جگہ چن لیتا۔ گماشتہ کا گھر کچہری کہلاتا تھا۔ یہاں وہ اپنے ہرکاروں کے ذریعے دلالوں کے نور بافوں کو جمع کرنے کا حکم دیتا پھر ان کو پیشگی دے کر عہد نامہ پر دستخط کراتا جس کی رو سے انہیں خاص مدت کے اندر اندر خاص مال تیار کرنا پڑتا۔ عہد نامے پر دستخط کے لیے غریب کاریگر کی رضامندی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ گماشتے جو شرطیں بھی چاہتے زبردستی منوا لیتے تھے۔ اگر کاریگر کمپنی کا روپیہ قبول کرنے سے انکار کرتا تو اسے کوڑے لگائے جاتے۔

ولیم بولٹس

"غریب ہندوستانی دستکاروں اور کاریگروں پر ایسے ایسے ظلم توڑے گئے جن کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ غریب کمپنی کے غلام بنا دیے گئے تھے۔ جرمانے، قید، جبری معاہدے اور بدنیتی نے نور بافوں کی نسل معدوم کر دی۔"

بولٹس

"صنعت و حرفت اور تجارت کے تنزل کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ڈھاکہ کی آبادی تقریباً برباد ہو گئی۔ ۱۸۰۰ء میں آبادی دو لاکھ تھی۔ اب صرف ۷۰ ہزار رہ گئی ہے۔ جتنی تیزی سے آبادی گھٹی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تیزی سے افلاس بڑھ گیا ہے۔

(جیمز ٹیلر ۱۸۳۸ء میں)

ہندوستان سے انگلستان کو اور انگلستان سے ہندوستان کو جو کپڑا بھیجا گیا اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

سنہ	ہندوستان سے	انگلستان سے
۱۸۱۷ء	۱۲۶۶۶۵۸ تھان	۸۱۸۲۵۸ گز
۱۸۲۱ء	۴۳۵۴۹۵ ،،	۱۰۱۳۸۷۳۶ ،،
۱۸۲۸ء	۴۲۲۵۰۴ ،،	۴۴۸۸۲۲۵۷۷ ،،
۱۸۳۵ء	۳۰۶۰۸۶ ،،	۵۱۷۷۷۲۷۷ ،،

"ڈھاکہ میں قدیم زمانہ سے ہر گھر کا مشغلہ سوت تیار کرنا تھا۔ لیکن اب ارزاں انگریزی سوت کی وجہ سے یہ کام بالکل بند ہو گیا ہے۔ اس طرح کاتنے اور بننے کی صنعت جس سے مدتوں لاکھوں محنتی انسانوں کا پیٹ پلتا تھا۔ ۶۰ برس کی قلیل مدت میں

اجنبی ہاتھوں میں چلی گئی۔"

براؤن

"ہندوستان میں انگریزی سوت سب سے پہلے ۱۸۰ء میں آیا۔ اس کے بعد اس کی مقدار بڑھتی چلی گئی چنانچہ

۱۸۲۴ء	میں	۱۲،۰۰۰ گز
۱۸۲۵ء	میں	۸۰،۰۰۰ ″
۱۸۳۰ء	میں	۴۰۵،۰۰۰ ″

(ایسٹ انڈیا کمپنی کے حالات)

"سب سے پہلے ۱۸۲۱ء میں انگریزی سوت ہندوستان آیا۔ ۱۸۲۷ء میں اس کی مقدار ۳۸۲۹۴ من تک پہنچ گئی۔ ۱۸۳۱ء میں ۸۲۸۱۰ من ہو گئی اور ۱۸۳۸ء کے بعد تو اس نے ہندوستانی سوت کو بالکل بے دخل کر کے ملک بھر میں اس کی جگہ لے لی۔"

جیمز شید

"جمہور کو ہر طرح پریشان کر کے ملک ویران کر دیا گیا۔ ۶۰ سال کی قلیل مدت میں دولت مند ملک کے نصف بڑے بڑے شہروں کو بالکل اجاڑ دیا گیا اور ۵ لاکھ بے ضرر اور محنتی انسانوں کو جلا وطن یا برباد کر دیا گیا۔"

(بنگال۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں)

"برطانوی صنعت بڑھانے کے لیے ہندوستانی دستکاری کا گلا گھونٹنا، بڑے فخر کے ساتھ انگریزی تدبر قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ برطانوی قساوت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے ملک کی ترقی کے لیے انگریزوں نے کس طرح چنگی اور محصول لگا کر ہندوستان کی صنعتی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔"

(شور)

"وہ انگریزی جولاہا ہی تھا۔ جس نے دیسی نوربافی کو ہلاک کر دیا۔ انگلستان نے خود ہندوستان کے بازاروں سے ہندوستانی کپڑا بے دخل کر دیا۔ اس نے ہندوستان میں اپنا سوت بھیجنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ دیسی سوت غائب ہو گیا۔ یہ ملک جو روئی کا مرکز تھا بدیشی سوت کا دست نگر ہو گیا۔ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۳۶ء تک ہندوستان میں انگریزی سوت کی درآمد ایک سے شروع ہو کر پانچ ہزار دو سو گنا ہو گئی۔"

کارل مارکس (زمانہ قیام انگلستان)

تعلیم کا اثر یہ ہوگا کہ فرقہ وارانہ خیالات اور تعصب دور ہو جائے گا۔ حالانکہ اسی تعصب کی بدولت ہم اب تک اس ملک پر قابض ہیں۔ اس کے ذریعے ہم مختلف قوموں کو آپس میں لڑاتے ہیں۔ تعلیم کا اثر یہ ہوگا کہ ان کے دماغ روشن اور وسیع ہو جائیں گے اور ہندوستانیوں کو اپنی قوت کا احساس ہو جائے گا۔"

سرائل سمتھ

"جب کبھی میں ہندوستان کی بے شمار مخلوق کی جہالت کا خیال کرتا ہوں تو مجھے کارلائل کا یہ از حسرت مقولہ یاد آجاتا ہے کہ علم کی صلاحیت رکھنے والے انسان کا جاہل رہنا میرے نزدیک ایک خوفناک المیہ ہے۔"

ڈاکٹر سی۔ ہل

۱۷۹۲ء میں تعلیمی کمیٹی (انگلستان) کے ایک ڈائریکٹر نے کہا تھا۔۔

"ہم نے امریکہ محض اپنی حماقت سے اس لیے کھو دیا کہ وہاں اسکول اور کالج قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اب ہمیں ہندوستان میں اس حماقت کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں صرف اس حد تک ہندوستانیوں کو تعلیم دینی چاہیے جس حد تک ہم ان سے اپنی تجارت اور حکومت چلانے میں فائدہ اٹھا سکیں۔"

"ہمیں ہندوستان میں ہندوستانیوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرنی چاہیے جو رنگ اور خون میں ہندوستانی ہوں۔ مگر ذوق، خیال اور ذہنیت میں انگریز ہوں۔"

میکالے

"۱۷۹۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر کہتے ہیں۔ تم ہندوستانیوں کو تعلیم دینا چاہتے ہو؟ تعلیم دے کر تم انہیں اپنی بے انصافیوں سے آگاہ کر دو گے تم نے ان کا ملک لوٹ لیا ہے۔ تم نے ان کے ہم وطنوں کو برباد اور ذلیل کیا ہے۔ تم نے ان کے بادشاہوں کو قتل کر ڈالا ہے۔ لہٰذا تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ تم انہیں اسی طرح فریب خوردہ، خود فراموش اور جاہل رہنے دو۔"

سر تھامس ٹرٹین

"جنگ پلاسی کے بعد ہی بنگال کی لوٹ انگلستان پہنچنے لگی، اور اس کا فوری اثر نمودار ہوا۔ تمام مورخ متفق ہیں کہ انگلستان میں جس صنعتی انقلاب نے انیسویں صدی کو تمام پچھلے زمانوں سے ممتاز کر دیا ہے، اس کی بنیاد اسی جنگ کے بعد ۱۷۶۰ء میں پڑی تھی۔"

بروک ایڈم

"سرسری اندازہ کے ساتھ بڑی آسانی سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ جنگ پلاسی اور جنگ واٹرلو کے درمیانی زمانہ میں ہندوستان سے انگلستان کو پندرہ ارب روپیہ جا چکا تھا۔"

میجر وین پگیٹ

"اکثر موجودہ یورپی قوموں کی خوشحالی، مشرقی قوموں کی لوٹ پر قائم ہوئی۔ انگلستان کی صنعتی برتری سراسر بنگال کے کسانوں کی لوٹ سے شروع ہوئی۔ جنگ پلاسی سے پہلے انگلستان کی صنعت نہایت پست اور منلوک الحال تھی۔"

ڈوگ بی

"ہندوستان کا نظارہ دماغ پر افلاس و افسردگی کا اثر قائم کر دیتا ہے۔ ملک سے زیادہ اس کے عام باشندے تباہ حال ہیں۔ وہ کمزور اور خستہ نظر آتے ہیں۔ ان کے کپڑے میلے کچیلے اور پھٹے پرانے ہوتے ہیں۔ وہ سب غریب اور تباہ حال معلوم ہوتے ہیں۔ وہ لاغر اور مرجھائے ہوئے ہیں۔"

سر فریڈرک ٹریوس

"برطانوی ہند کی دیہاتی آبادی کی حالت کیا ہے؟ اب وہ اس مطمئن اور خوش وضع قوم کی نمائندگی نہیں کرتی۔ جس کا حال ہم قدیم تاریخوں میں پڑھتے ہیں۔ شکستہ روح، پست دماغ، خستہ حال غریب رعایا کی یہی ایک آرزو رہ گئی ہے کہ آئندہ فصل پکنے تک وہ بھوکوں نہ مر جائے۔ جنگل کٹ جانے کی وجہ سے ہندوستان کے باشندوں پر روزی معیشت اور بڑھ گئی ہیں۔ ایندھن کا فقدان اور بارش کی کمی صحت خریدی جا سکتی ہے۔ تعلیم خریدی جا سکتی ہے۔ طبی امداد خریدی جا سکتی

ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کے پاس خریدنے کی طاقت کہاں۔ یہاں تو ہر ہندوستانی کی آمدنی ایک آنہ ہے۔ اگر کبھی انگریزوں کو ہندوستان اسی طرح چھوڑنا پڑا جس طرح رومیوں نے انگلستان چھوڑا تھا تو وہ ایک ایسا ملک چھوڑ جائیں گے جس میں نہ تعلیم ہوگی، نہ حفظانِ صحت کا سامان اور نہ دولت" سرڈگبی ہلٹن

(ماخوذ و منقول از جریدہ الہلال)

لہو پکارے گا آستیں کا

انگریزوں کے مظالم ان کی اپنی ڈائریوں اور یادداشتوں کے حوالے سے

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے ہمارے برصغیر میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ایک نیا در کھلا جس نے ایک نئے دور کا آغاز کیا، ایک نئی روشنی ہمارے معاشرے ہمارے تمدن اور ہمارے ادب میں آئی۔ نئی تحریکوں نے جنم لیا اور مسلمانوں نے خاص طور پر اپنے علیحدہ تشخص کی ضرورت کو محسوس کیا۔ لیکن انگریزوں نے جنگِ آزادی یا ان کی اپنی زبان میں "غدر" کے زمانے میں برصغیر کے مسلمانوں اور دوسری قوموں پر کیا کیا مظالم توڑے؟ ان کی خبر اس عہد کے مورخین کو بھی تھی لیکن ان واقعات کا لکھنا جرم تھا! انگریزوں کے خلاف ایک جملہ لکھنے والوں کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ مغربی مصنفین اور مورخین نے اس عہد کے ظلم و ستم کو لفظ بہ لفظ قلم بند کیا۔ ادیبوں، صحافیوں کے علاوہ کچھ پادریوں، فوجی افسروں اور گمنام انگریزوں کی ایسی دستاویزات ملی ہیں جن میں انہوں نے انگریزوں کے ظلم اور بربریت کو مکمل تاریخی حوالے سے رقم کیا ہے۔ اگرچہ بعض حقائق اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور الزام زیادہ تر بلکہ قدرتی طور پر ہندوستان کے رہنے والوں پر لگایا گیا ہے۔ اس کے باوجود انگریز حکمرانوں کی بربریت اور وحشت کی داستان من و عن بیان کی گئی ہے۔

اب ایک انگریز مورخ ایڈورڈ ٹامسن کی ایک یادداشت پیش کی جاتی ہے اس کتاب کو پورے کا پورا ہم نقل نہیں کر سکتے لیکن اس کے خاص الخاص اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں۔

اس زمانے میں امرتسر کا ڈپٹی کمشنر مسٹر کوپر تھا۔ اس درندہ صفت انسان کی سفاکی کا اندازہ خود اس کی یادداشتوں اور خطوں سے ہوتا ہے جن کا حوالہ مسٹر ٹامسن نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔

یہ کوپر صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔۔

"جو لوگ ہمارے جیل خانوں میں قید ہیں۔ ان کی نجات کا راستہ نہایت آسان ہے۔ یعنی باغیوں کو دیکھتے ہی فی النور نکلسن کا نعرہ بلند کیا جائے۔ انہیں پھانسی پہ لے چلو۔"

گویا قیدیوں کی نجات اسی میں تھی کہ وہ قیدِ زندگی سے نجات پا جائیں۔ ایک پادری کی بیوی نہایت فاتحانہ انداز میں لکھتی ہے کہ "جب بہت سے باغی گرفتار کر کے لائے گئے تو ان کو حکم دیا کہ گرجا کے فرش کو صاف کریں۔ اگرچہ یہ لوگ اپنے عقائد کی بنا پر اس قسم کا کام خلافِ مذہب سمجھتے تھے لیکن سنگینوں کی نوک سے انہیں اس کام کے لیے مجبور کیا گیا۔ ان میں سے بعض نے نہایت پھرتی سے اس کام کو سر انجام دیا محض اس خیال سے کہ شاید پھانسی سے بچ جائیں، لیکن بے سود، کیونکہ وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔"

ضلع شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور منٹگمری سے سینکڑوں مسلمانوں کو گرفتار کر کے لایا گیا اور ان کے لیے شاہی مسجد میں پھانسی کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس واقعے کے بارے میں عینی شاہد بمنیڈی لکھتا ہے:

"وہ رات ہم نے پہرہ دینے میں بسر کی اور ہمارا زیادہ تر وقت ان قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے یا پھانسی پر لٹکانے میں گزرا۔ جنہیں ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا۔"

ایک انگریز مورخ لکھتا ہے!

"ہندوستانیوں کو اس کثرت سے پھانسیاں دی گئیں کہ بیان سے باہر ہے۔ الہ آباد سے کانپور آتے ہوئے دو دن کے اندر ۴۲ آدمیوں کو پھانسی دی گئی اور ۱۲ آدمیوں کو تو صرف اس جرم میں پھانسی دی گئی کہ جب فوج مارچ کرتی ہوئی ان کے سامنے سے گزری تو ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے۔ جہاں جہاں فوج پڑاؤ کرتی تھی، وہاں قریب و جوار کے تمام دیہات کو نذرِ آتش کر دیتی تھی۔ یہ کہنا کہ یہ کانپور کے مظالم کے حادثے کا جواب تھا صحیح نہیں، کیونکہ کانپور کا شیطانی واقعہ ان حوادث کے بہت بعد پیش آیا۔"

مسٹر ٹامسن ایک جگہ پرزور الفاظ میں لکھتے ہیں:

"آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں حکومتِ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو بھی پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا۔"

ایک انگریز رقمطراز ہے:۔

"دہلی میں خونریزی کے عادی سپاہیوں نے جوشِ انتقام کو فرو کرنے کے لیے پھانسی دینے والے جلادوں کو رشوت دے کر آمادہ کیا تھا کہ وہ پھانسی کے تختے پر لوگوں کو زیادہ دیر تک لٹکتے رہنے دیں تاکہ ان کے تڑپنے کی دلکش کیفیت دیکھ کر جسے وہ ناچ کہتے تھے، اپنی تو نواز طبائع کے لیے دلچسپی کا سامان بہم پہنچا سکیں۔ جھجر کے نواب صاحب کو جان دینے میں بہت عرصہ لگا۔"

مسٹر ٹامسن حریت پسندوں کو پھانسی دینے کے طریقے کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔۔

"پھانسیاں دینے کے لیے رضا کاروں کی ٹولیاں بنائی گئیں۔ جنہوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے دیہات کا دورہ کیا۔ اس حالت میں کہ ان کے پاس پھانسی دینے کا سامان بھی مکمل نہیں تھا۔ اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریقے سے پوری واقفیت تھی، چنانچہ ان رضا کاروں میں سے ایک "شریف آدمی" اپنی کامیابی کا اس طرح فخریہ اظہار کرتا ہے کہ ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کیا کرتے تھے۔ یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے تھے اور اوپر سے رسہ ڈال کر ہاتھی کو ہنکایا جاتا تھا، یہاں تک کہ ملزم اس طرح سے تڑپنے اور جان کنی کی حالت میں اکثر اوقات انگریزی کے آٹھ (8) کے ہندسے کی دلچسپ شکل بن کر رہ جاتا تھا۔"

"لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا، چنانچہ ہر ہندوستانی کو قطع نظر اس کے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی، بے دریغ تہ تیغ کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس سے نہ کوئی سوال کیا جاتا تھا اور نہ اس قسم کا تکلف روا

رکھا جاتا تھا، بلکہ محض سیاہ رنگ ہی اس کے مجرم ہونے کے لیے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اور ہلاکت کے لیے ایک رسا اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔"

مسٹر ٹامسن دہلی پر انگریزی فوج کے قبضے کے بعد اپنے مشاہدات قلم بند کرتے ہیں:

"دہلی میں شہر کے بلند مقام پر ایک چوکور سُولی نصب کی گئی تھی، جہاں پر روز پانچ اور چھ اشخاص کو ایک ساتھ پھانسی دی جاتی تھی۔ سُولی کے قریب ہی انگریز افسران سگریٹوں کے کش پر کش اڑاتے ہوئے لاشوں کے تڑپنے کے نظاروں میں محو دکھائی دیتے تھے۔"

۱۸۵۷ء کے پورے المیے میں بریگیڈیئر جنرل جان نکلسن کا کردار سب سے گھناؤنا ہے۔ یہ شخص لومڑی کی طرح مکار اور اس چیتے کی طرح خونخوار تھا، جس کے منہ کو انسانی خون کی چاٹ لگ جائے۔ نکلسن ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کی بنگال انفنٹری میں ایک سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوا اور ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک افغانستان کی پہلی لڑائی میں لڑا۔ ۱۸۴۸ء میں ملتان پر مل راج کے قبضے کے دوران میں نکلسن کا زیادہ وقت پنجاب کے علاقے ہی میں گزرا اور یہیں اسے اپنی خدمات کے صلے میں ترقی ملنی شروع ہوئی۔ نکلسن نے سکھوں اور کچھ غداروں کی مدد سے اٹک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اسی زمانے میں راولپنڈی کے قریب مارگلہ کی پہاڑی پر وہ شدید زخمی ہوا۔ مارگلہ کے مقام پر آج تک نکلسن کی ایک یادگار نصب ہے۔ وہ شخص جس نے نکلسن کی جان بچائی تھی اس کی اولاد اپنے بزرگوں کی ملک و ملت سے غداری کے صلے میں ملنے والی وسیع و عریض جاگیروں پر آج تک دادِ عیش دے رہی ہے۔

جب رنجیت سنگھ کی حکومت نے باقاعدہ معاہدے کر کے کمپنی کی حکومت سے الحاق کر لیا تو نکلسن کو بنوں کا ڈپٹی کمشنر بنا دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں جب ملک میں جنگِ آزادی شروع ہوئی تو نکلسن پشاور میں تھا۔ جنگِ آزادی کا مرکز چونکہ دہلی تھا لہٰذا نکلسن اور ایڈورڈز لارنس فوراً پشاور سے دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ نکلسن اور اس کے سپاہی تمام راستے بے گناہ دیہاتیوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارتے رہے۔ چنانچہ مسٹر ٹامسن اس سفر کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز افسر کی چٹھی نقل کرتے ہیں۔

"لارڈ ایبرٹس اپنی والدہ کو ایک خط میں لکھتا ہے۔ ہم پشاور سے جہلم تک پاپیادہ سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستے میں کچھ کام بھی کرتے آئے۔ یعنی باغیوں سے اسلحہ چھینا اور انہیں پھانسی پر لٹکا دیا:

"چنانچہ توپ سے باندھ کر اڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے اکثر استعمال کیا ہے۔ اس کا لوگوں پر ایک خاص اثر ہوا اور ہماری ہیبت لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ یہ طریقِ سزا نہایت دلخراش ہے۔"

دہلی کے محاصرے کے وقت کشمیری دروازے پر حملے کی قیادت نکلسن نے کی اور شہر میں داخل ہوتے ہی اس کی فوجوں کو جو شخص بھی نظر آیا، اسے قتل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مسٹر ٹامسن لکھتے ہیں۔

"انگریزوں نے راستے میں سیکڑوں میل تک سڑک کے دیہاتیوں کو بے دریغ قتل کر کے ملک کو صحرا کی طرح ویران اور سنسان کر دیا۔ دہلی سے باغیوں کے فرار کے بعد انگریز فاتحین نے باشندوں کا قتلِ عام کیا اور بے ضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہری پھانسی کے تختے پر لٹکا دیے گئے۔ حالانکہ ان کا بغاوت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔"

اس کے بعد دہلی کے قتلِ عام کا یوں ذکر کرتے ہیں:

"دہلی میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی منادی کی گئی......ہمارے اکثر نوجوان تو محض خون گرمانے کی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی اور پوربی گھسیاروں وغیرہ کو گولی سے اڑا دینے کی تمنا کا اعلانیہ طور پر اظہار کر چکے تھے"

جان نکلسن، ایڈورڈز کو ایک خط میں دہلی کے مظلوم عوام کے لیے سزا تجویز کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیے جس کی رُو سے ہم انہیں زندہ بھی جلا سکیں، یا زندہ ان کی کھال اتار سکیں، یا گرم سلاخوں سے ان کو اذیت دے کر موت کے گھاٹ اتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کیے دیتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں سنگین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔"

مسٹر ٹامسن اس کے بعد لکھتے ہیں:

"نکلسن کو اپنی آرزو کو پورا ہونے میں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مسٹر موبری تھامسن نے اپنے بعض قیدیوں کی دردناک سرگزشت سر سیٹن کاٹن کو ذیل کے الفاظ میں سنائی۔ شام کے وقت ایک سکھ اردلی میرے خیمے میں آیا اور سلام کر کے پوچھنے لگا۔۔۔ آپ غالباً یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ میں فوراً لپک کر قیدیوں کے خیمے میں گیا۔ جہاں ان بدبخت مسلمانوں کو عالمِ نزع میں بے حال دیکھا یعنی ان کی مشکیں بندھی ہوئی ہیں اور وہ برہنہ زمین پر لیٹے ہوئے تھے اور سر سے لے کر پاؤں تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغ دیا گیا تھا۔ اس دل خراش نظارے کو دیکھ کر میں نے اپنے پستول سے ان کا خاتمہ کر دینا ہی ان کے حق میں مناسب سمجھا۔"

انگریزوں نے برصغیر کے عوام پر جس بربریت اور سفاکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس پر خود انگریز مورخین بھی چیخ اٹھے۔ چنانچہ مسٹر ٹامسن ایک جگہ احتجاج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ بدنصیب قیدی کے جلتے ہوئے گوشت سے کر وہ بدبُو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی۔ انیسویں صدی میں جب کہ تہذیب و شائستگی پر ناز کیا جاتا تھا۔ ایک ایسا دردناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک انسان نہایت وحشیانہ طریقے سے زندہ جلایا جا رہا ہے اور سکھ اور یورپین نہایت اطمینان اور خوشی سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر اردگرد کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ گویا وہ ایک تفریح کا سامان تھا۔"

مسٹر ٹامسن ایک اخبار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈی لین نے لکھا تھا: زندہ مسلمانوں کو سؤر کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سؤر کی چربی ملنا یا زندہ جلانا...... ایسی کروہ اور متعصبانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب بھی کبھی اجازت نہیں دیتی۔ ہماری گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں۔"

یہ ہیں جان نکلسن کے وہ کارنامے جن کی بدولت انگریز قوم اس شخص کو آج تک اپنا سرمایہ افتخار تصور کرتی ہے۔ وہ نکلسن جس کی شان میں انگریزوں نے قصیدے لکھے، جس کے حالاتِ زندگی کو ہیکٹ بیرمن نے قلمبند کیا تو کتاب کا نام "دہلی کے ہیرو" رکھا۔ انگریز قوم کا یہ "ہیرو" دہلی میں لاہوری دروازے کے باہر بیچھے کچھ لوگوں سے

لڑتے ہوئے اس طرح مارا گیا کہ گولی اس کی پیٹھ میں لگی تھی! لیکن انگریز مورخوں نے اس کی اس ذلیل موت کو بھی اس کی فتح مندی سے تعبیر کیا، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا میں نکلسن کی موت کے بارے میں مختلف تاریخوں کے حوالے سے یہ نوٹ لکھا گیا:

"نکلسن نے لاہوری دروازے کے قریب رکاوٹوں کو ہٹانے کے سلسلے میں اپنے ذمہ وہ کام لے لیا جو اس کی طاقت سے باہر تھا۔ اس کی تھکی ہاری فوج آگے بڑھنے سے ہچکچا رہی تھی۔ چنانچہ نکلسن اپنی فوجوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے دشمن کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا اور اس طرف سے ایک گولی آ کر اس کی پیٹھ میں پیوست ہو گئی۔"

یہ تھی انگریز قوم کے تاریخی ہیرو نکلسن کی بہادر فوج جو مقابلے سے ہچکچا رہی تھی۔ اور نکلسن صاحب بھی میدان سے بھاگے نہیں؛ صرف دشمن کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو گئے تھے۔"

ایک طرف سامراجی انگریزوں کی یہ حالت تھی۔ دوسری طرف برصغیر کے وہ حریت پسند تھے جو پھانسی کے تختے پر بھی آزادی کا نعرہ بلند کرتے تھے۔ مسٹر ٹامسن اپنی کتاب میں ایک انگریز نامہ نگار کے حوالے سے مندرجہ ذیل واقعہ تحریر کرتے ہیں:

"لڑائی کے اختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور یہ معلوم ہونے پر کہ اس قسم کی موت کی وہ کوئی خاص پروا نہیں کرتے تو ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ چنانچہ ایک روز ایک توپ کے بہت بڑے دھماکے سے ہم چونک پڑے، جس کے ساتھ ہی ایک ناقابل بیان دھیمی مگر دہشت ناک چیخ بھی سنائی دی۔ دریافت کرنے پر ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ یہ نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا۔ یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھرا ہوا تھا۔ جس کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے اور اس کا سر ایک راہ گیر پر اس زور سے گرا کہ اس کے بھی چوٹ آئی۔"

ایک طرف دہلی میں لال قلعے کی چھاؤں میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی اور دوسری طرف کانپور اور لکھنؤ میں عام آبادی کا قتل عام جاری تھا اور اس سلسلے میں بوڑھوں بچوں، عورتوں کو صرف سولی پر لٹکانے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ ٹامسن کے الفاظ میں ــــ

"دیہات میں ان کو مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا اور شاذ و نادر ہی کسی کو گولی مارنے کی تکلیف گوارا کی ہوگی۔ انگریزوں نے فخریہ لکھا ہے کہ ہم نے حتی الامکان کسی بھی ذی روح کو زندہ نہیں رہنے دیا۔ بے گناہ شہریوں کو جب وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے، گولی کا نشانہ بنا دیا گیا، بلکہ عمر رسیدہ انسانوں کو بھی جن کے جسم رعشے سے کانپ رہے تھے کاٹ کر رکھ دیا گیا۔"

اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے انگریزوں نے دنیا بھر میں یہودیوں پر نازیوں کے مظالم کا شور مچایا۔ لیکن انگریزوں نے برصغیر کے عوام کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا اس کے آگے ظلم و بربریت کی تمام کہانیاں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ خود انگریزوں کے مہیا کردہ اعداد و شمار کے مطابق صرف دہلی شہر میں جن لوگوں کو پھانسی دی گئی ان کی تعداد تین ہزار تھی۔ ان میں انتیس افراد کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ ستائیس ہزار مسلمان قتل کیے گئے۔ اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔

سر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر نے لکھا۔

"لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ مسلمانوں کو بے جان اور ضعیف خیال کرتے ہیں۔ شاید ایسا ہو مگر بہت سے شکاریوں کو تجربات کے بعد یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ اگر کسی عالی نسب شیر پر زخم لگایا جائے تو وہ ایسا ہی ضعیف اور ناتواں بلکہ قریب المرگ ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی اپنی اصل حرارت کے ساتھ ایک مرتبہ جست لگا کر چاروں طرف ہلاکت اور تہلکہ مچا دے گا۔"

مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کا بیان ملاحظہ ہو۔

"صفر ۱۲۷۴ھ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو بادشاہ کے سمدھی (الٰہی بخش) کی جاسوسی سے مسٹر ہڈسن نے تین شہزادوں مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کیا، اور تینوں کے سر قلم کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیے۔ بادشاہ نے ہنس کر کہا۔ تیموری خاندان کے بہادر فرزند اسی طرح سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتے ہیں۔"

(انقلاب ۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ)

ترجمہ: حسام الدین

کرنل ہارلائیڈ کا ایک انگریز اسسٹنٹ ڈیوڈ پیٹرسن گمنام سپاہی تھا۔ ولایت میں اسے صحافی بن کر نام پیدا کرنے کا شوق تھا۔ لیکن وہ انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر برصغیر آ گیا۔ اس خیال سے کہ وہاں سے وہ دولت کما کر لائے گا اور لندن آ کر اپنا اخبار جاری کرے گا۔ غدر کے ہنگاموں کو اس نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان واقعات کی ایک یادداشت مرتب کرتا رہا۔ اس کا ارادہ انہیں لندن جا کر اپنے زیر تجویز اخبار میں قسط وار شائع کرنے کا تھا۔ لیکن یہ نوجوان دہلی سے پنجاب کی طرف ایک خاص پیغام لے جاتے ہوئے راستے میں مارا گیا۔ اس کی ڈائری کسی طرح باقی رہی اور بعد ازاں بہت کچھ سنسر ہو کر لندن کے ایک اخبار میں شائع ہوئی۔ اس ڈائری کے اقتباس ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ اقتباس مولوی عنایت علی بجنوری کے ایک رسالے سے لیے گئے ہیں جو مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال میں پہلی بار شائع ہوئے۔ ڈیوڈ پیٹرسن اس وقت کا حال لکھتا ہے جب حریت پسند دہلی کا کشمیری گیٹ والا مورچہ کھو چکے تھے اور انگریزی فوج دہلی میں داخل ہو گئی تھی۔ تاریخ اور دن اس ڈائری سے شاید نہیں لیے گئے یا ہو سکتا ہے کہ ڈیوڈ پیٹرسن نے دن اور تاریخ اپنی یادداشت میں کسی وجہ سے نہ لکھی ہو۔

بہر حال ہم اسے ویسے ہی نقل کر رہے ہیں۔

"ہم دلی کے ایک محلے میں آ گئے جہاں کے مسلمان اپنی آزادی اور حریت پسندی کی وجہ سے مشہور تھے۔ اور جنہوں نے بغاوت کو مذہبی جنگ قرار دیا تھا۔ یہاں ہمیں خبر ملی کہ نکلسن کو ایک گلی میں قتل کر دیا گیا ہے۔ ہم گورا فوج کے سات آٹھ سپاہی تھے۔ میں اس گروہ میں اس لیے شامل ہو گیا تھا کہ مجھے اپنے زیر تجویز اخبار کے لیے اس تحریک آزادی کا زیادہ مواد درکار تھا۔ میرے خیالات ایک آزاد اخبار نویس اور ادیب کے خیالات تھے۔ یعنی میں اس غدر کو تاریخ کا ایک سیاسی اور ناگزیر عمل سمجھتا تھا اور میرا ایمان تھا کہ ہم یعنی اہل برطانیہ ہندوستان کے رہنے والوں کا حق آزادی غصب کر رہے ہیں۔ مگر ان خیالات کو میں کسی کے آگے ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس ڈائری میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ یہاں میں اپنے دل کی بات کھل کر کہہ رہا ہوں۔ مجھے

میں جتنے مکان تھے سب کھلے پڑے تھے۔ یعنی ان کے بڑے دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ہم نے نکلسن صاحب کے قتل کی خبر سنی تو بڑا رنج ہوا۔ میرے ساتھیوں کا تو خون کھول اٹھا۔ انہوں نے ایک مکان کی کھڑکیوں کی طرف رُخ کر کے فائر جھونک دیا۔ شاید وہاں ہمیں کچھ لوگوں کے چہرے نظر آئے تھے۔ ایک مکان میں داخل ہوئے تو وہاں دالان میں ایک بڈھے کی لاش پڑی تھی۔ میرے ایک ساتھی نے اس لاش کے سینے میں سنگین اتار دی۔ اس طرح سے بھی جب اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو اس نے پے در پے وار کر کے لاش کو ادھیڑ ڈالا۔

مجھے اپنے ساتھی کی یہ حرکت غیر انسانی لگی۔ میں اسے منع کر کے خود بغاوت کا مجرم نہیں بننا چاہتا تھا۔ ہم نے اس مکان کو آگ لگا دی: دوسرے محلے میں ہمارے دوسرے انگریز فوجی ساتھی لوٹ مار، قتل و غارت گری اور آتش زنی میں مصروف تھے۔ اس مکان سے لوگوں کی چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اپنے گروہ سے الگ ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ ایسا ہو سکتا تھا کہ کسی کونے کھدرے میں چھپا ہوا حریت پسند میری پیٹھ میں خنجر گھونپ دے۔ سامنے ایک مسجد تھی۔ مسجد کی سیڑھیوں پر خون جما ہوا تھا۔ ایک ہندو ہمارے پاس آیا۔ وہ جھک کر زمین کے ساتھ لگ گیا اور پھر اپنی زبان میں ہاتھ جوڑ کر بولا کہ مسجد کے پچھواڑے ایک مسلمان کا گھر ہے جہاں ایک انگریز گورے کو قتل کیا گیا تھا۔ شاید ایسا کہہ کر یہ ہندو ہماری ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال ہم نے اسے کچھ نہ کہا اور مسجد کے پچھواڑے والے گھر میں گئے۔ یہ ایک بڑی کشادہ اور اونچی حویلی تھی۔ دالان میں ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا ہوا تھا۔ لوٹ مار ہو چکی تھی۔ لکڑی کی بالکونی برآمدے کے ساتھ ساتھ گھومتی چلی گئی تھی۔ ہم تنگ سیڑھیاں طے کرتے دوسری منزل پر آ گئے۔ یہاں کمرے کھلے تھے اور سامان بکھرا ہوا تھا۔ ایک کوٹھڑی میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ ہم ٹھٹھک گئے۔ آواز کسی بچے کی تھی۔ ہم لپک کر کوٹھڑی کے اندر گئے۔

ایک سات آٹھ برس کا لڑکا پلنگ کے نیچے چھپا رو رہا تھا۔ قریب ہی اس کی ماں کی لاش پڑی تھی۔ لاش کی گردن آدھی کٹی ہوئی تھی۔ میرے ساتھیوں نے اسے موقع پر قتل کرنا چاہا لیکن میں نے جرأت کر کے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ جواز یہ پیش کیا کہ اس لڑکے کو تسلی دے کر اس سے پوچھ گچھ کی جائے اور معلوم کیا جانا چاہیے کہ اس گھر میں جس انگریز کو قتل کیا گیا تھا وہ کون تھا اور کیسا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میرے ساتھی مان گئے اور ہم نے لڑکے کو کھینچ کر پلنگ کے نیچے سے نکالا اور اسے ساتھ لے کر مکان سے باہر آ گئے۔ لڑکا بے حد سہما ہوا تھا اور روئے جا رہا تھا۔ میرے ایک ساتھی نے اس کی پسلی پر سنگین کی نوک رکھ دی اور انگریزی میں اسے ڈانٹ کر کہا کہ اگر آواز نکالی تو سنگین سے پیٹ پھاڑ دوں گا۔ لڑکا ایک دم چپ ہو گیا۔ مگر اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

میں اس لڑکے کو لے کر اپنی بارک میں آ گیا۔ اسے انڈا کھلایا۔ لڑکے کو تسلی دی کہ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اس نے ہماری پوچھ گچھ پر صرف اتنا ہی بتایا کہ ایک انگریز زخمی حالت میں ان کی حویلی میں آیا تھا۔ میرے باپ نے اس کی مرہم پٹی کرنی چاہی مگر وہ طبی امداد ملنے سے پہلے ہی مر گیا۔ لڑکا سچ بول رہا تھا۔ مگر میرے ساتھیوں کو یقین نہ آیا۔ انہوں نے لڑکے کو قتل کر کے باہر کھائی میں پھینک دینا چاہا۔ مجھے اس لڑکے پر ترس آ گیا تھا۔ کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ لڑکا جھوٹ نہیں بول رہا اور وہ بے گناہ ہے۔ میں اسے آدھی رات کو لے کر بارک سے نکلا اور گھوڑے پر بٹھا کر ہمایوں کے مقبرے کے پاس چھوڑ دیا۔ کیونکہ لڑکے نے کہا تھا کہ وہ مقبرے جانا چاہتا ہے۔ معلوم نہیں وہاں اس کا کون تھا۔ بہر حال اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ اس لڑکے پر کیا گزری۔"

"ہم شہر میں گشت کرتے ایک چوک میں سے گزرے۔ شہر تقریباً خالی ہو چکا تھا اور شرفا ہجرت کر چکے تھے۔ ہماری فوج کے سپاہی اور ہندو سکھ لوٹ مار سے جی بھر چکے تھے۔ اب شہر میں لوٹ مار کرنے کو کچھ بھی نہ رہا تھا۔ کئی محلوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ایک جگہ باؤلی تھی جس کے اوپر بیری کے گھنے درخت کی چھاؤں تھی۔ یہاں میں نے ایک ہندوستانی فقیر کو دیکھا کہ حالت جذب میں ہاتھ ہلا رہا ہے اور پھر وہ ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور زور زور سے اپنی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ ایک سپاہی نے بندوق چھین لی، چاہتا تھا کہ اسے گولی مار کر اڑا دے کہ جانے اس کے جی میں کیا آئی۔ بندوق کندھے پر رکھ لی اور فقیر کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ فقیر اب ہنس رہا تھا اور ایک ہاتھ سے بار بار آسمان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ہم آگے نکل گئے۔"

"قلعے کے میدان میں لوگوں کا ہجوم تھا اور ہمارے سپاہی ٹولیوں کی شکل میں لوگوں کو گولیوں کی باڑھیں مار رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے، جنہوں نے اپنے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد میں حصہ لیا تھا۔ ہو سکتا ان میں کچھ بے گناہ بھی ہوں۔ یہ لوگ بڑے سکون سے موت کو گلے لگا رہے تھے۔ میں نے کسی ایک کو بھی روتے چلاتے یا رحم کی بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ ان میں شاید سبھی مسلمان تھے۔ کیونکہ ہندو ہمارے مخبر تھے۔ اور سکھ باقاعدہ ہماری فوج میں شریک تھے اور انہوں نے ہمارے شانہ بشانہ رہ کر حریت پسندوں سے جنگ کی تھی۔"

"میں ایک مکان میں داخل ہوا تو وہاں ایک کوٹھڑی کے باہر فرش پر کتاب کے ورق بکھرے پڑے تھے۔ میں نے انہیں اٹھا کر دیکھا۔ اردو یا شاید فارسی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ تحریر ہاتھ کی تھی۔ چھپا ہوا خط نہیں تھا۔ میں نے ایک کاغذ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ بعد میں ایک ایسے سکھ سے میں نے اسے پڑھوایا۔ اس نے بتایا کہ یہ ورق دیوان سعدی کے ایک قلمی نسخے کا ہے۔"

"سارا دن میرے ساتھی سپاہی دریا کنارے کی ایک کوٹھی سے مال و دولت سمیٹتے رہے۔ بڑے بڑے نایاب قسم کے جواہرات ایک جگہ سے فرش کھودنے پر دستیاب ہوئے۔ یہ جواہرات ایک تانبے کی صراحی میں ڈال کر دبا دیئے گئے تھے۔ سپاہیوں نے جواہرات آپس میں بانٹ لیے۔ اس کوٹھی میں ہم نے چار لاشیں جوان لڑکیوں کی پڑی دیکھیں۔"

۔ آج لکھنؤ کے ایک بازار سے گزرتے ہوئے ایک آدمی کو دیکھا کہ سر کے بال بکھرے ہو رہے تھے اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا اٹھا کر آوازیں دے رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے جوان بیٹے کو پکار رہا تھا جسے انگریزی سپاہیوں نے توپ کے آگے باندھ کر اڑا دیا تھا۔"

" ایک بوڑھی عورت اپنی حویلی کی ڈیوڑھی میں بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں تک رہی تھی۔ اس سے اس کا نام پوچھا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ جانے ہمارے ایک سپاہی کے جی میں کیا آئی کہ اس نے بڑے آرام سے بندوق کی نالی اس عورت کے سر کی طرف کی اور گولی چلا دی۔ بارود کے دھماکے میں اس عورت کا سر پاش پاش ہو گیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہمارے سپاہی ذرا سی بات پر، بلکہ کسی وقت محض دل بہلانے کے لیے اور کسی وقت جوشِ انتقام میں آ کر یونہی کسی نہ کسی دیسی آدمی کو سنگین مار کر یا گولی مار کر قتل کر دیتے تھے۔ سوچتا ہوں کیا میں یہ احوال اپنے اخبار میں چھاپ سکوں گا؟ ..."

ڈائری کے مندرجات ابھی اور بھی ہیں لیکن ان سب میں ایک ہی طرح کے واقعات ہیں جن میں حریت پسندوں اور بے گناہوں کو گوروں کے ہاتھوں بے دردی سے قتل ہوتے اور توپ دم ہوتے دکھایا گیا ہے۔

منقول از (جریدہ الہلال)

اختتامیہ

یہ تھے انقلابات جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے جنہوں نے آگے چل کر ہماری اردو نثر اور شاعری پر اپنے شدید اور گہرے اثرات چھوڑے۔ اگر ہم پوری تفصیل اور تجزیے کے ساتھ جنگ آزادی کے حالات اور واقعات کو بیان نہ کرتے تو ہمیں آگے چل کر بعد کی شاعری اور اردو نثر کی جدید تحریکوں کو سمجھنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہم نے پچھلے صفحوں میں غدر کے بارے میں دو مکاتب فکر کے نقطۂ نظر بیان کیے ہیں تاکہ ہم وضاحت کے ساتھ غدر کے واقعات کو دیکھ سکیں۔ ان کا داخلی اور خارجی جائزہ لے سکیں اور پھر کسی مثبت نتیجے پر پہنچ سکیں۔ اب ہم جب اگلی کتاب میں سرسید کی نثر اور ان کے بعد آنے والے نثر نگاروں کی زندگی ان کے عہد اور ان کی نگارشات کو پیش کریں گے تو ہم ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کر سکیں گے۔

روشن کتابوں کا ایک روشن سلسلہ

مسلم شخصیات کا
انسائیکلوپیڈیا
(تاریخِ اسلام کے آئینے میں)

ہر ماہ کی یکم تاریخ کو دُنیا بھر کی عظیم اور نامور
مسلم شخصیات
کے
حالاتِ زندگی اور انقلاب آفریں کارناموں کے ساتھ
جلوہ گر ہوتا ہے!

اس روشن سلسلے کی
سات اقساط چھپ چکی ہیں!

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

اُردو شعر کا ایک مستند تاریخی و اَدبی سلسلہ

اُردو شعر کی داستان

اُردو شعر کی قدیم ترین تاریخ سے
لے کر آج تک کے شعری اَدب پر محیط
ایک تحقیقی، علمی و اَدبی پیش کش

جو
ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ کو
پیش کی جاتی ہے۔

اس روشن سلسلے کی چھ اقساط چھپ چکی ہیں!
آج ہی اپنے قریبی بکسٹال / ہاکر سے طلب فرمائیں۔

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور